www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2012 • No. 429 • Rs. 15

دشمن سے مقابلہ کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب
تدبیر یہ ہے کہ دشمن کو اپنا دوست بنالیا جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-2435 6666, 4652 1511
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹300
Three years ₹450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اگست 2012

فہرست

روزے کا مقصد 2

ایمان اور عمل 3

ربوبیت کا نظام 4

تمکین فی الارض 9

قرآن کا تصورِ تاریخ — ایک جائزہ 12

امتِ مسلمہ کو درپیش چیلنج 32

ایک خطاب 35

ایک خط 38

شبِ قدر 39

سوال و جواب 42

خبرنامہ اسلامی مرکز — 217 47

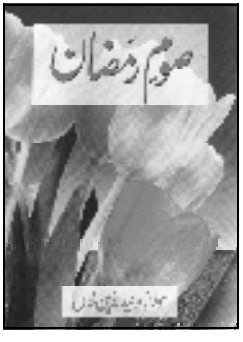

روزے کا مقصد

روزے کا مقصد احساسِ شکر کو پیدا کرنا ہے۔ غذا آدمی کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ غذا شکر کا بہت بڑا آئٹم ہے۔ روزے میں آدمی کو غذا سے وقتی طور پر روک کر شکر کی نفسیات کو جگایا جاتا ہے، تاکہ اِس تجربے کی بنا پر آدمی دوسری نعمتوں کے بارے میں بھی شکر کرنے والا بنے۔ ایک مہینے کا روزہ آدمی کے اوپر اِس لیے فرض کیا گیا ہے، تاکہ وہ سال کے بقیہ دنوں میں بھی خدا کا شاکر بنا رہے۔

انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ اس کی نفسیات میں کسی کیفیت کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ شکرِ خداوندی کی کیفیات میں زندگی گزارے۔ اِس لیے ہر سال کے ایک مہینے میں روزے کے ذریعے شکر کی کیفیت کو ری ایکٹویٹ (re-activate) کیا جاتا ہے، تاکہ آدمی کبھی شکر کی کیفیت سے خالی نہ ہونے پائے، وہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے ہر تجربے کے بعد شکر کا رسپانس (response) دیتا رہے۔

دین کا خلاصہ اللہ سے تعلق ہے۔ اللہ سے تعلق قائم ہونے کے بعد انسان کے اندر اپنے مُنعم حقیقی کے لیے اعتراف (acknowledgement) کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اِسی اعتراف کا شرعی نام شکر ہے۔ جہاں شکر نہ ہو، یقینی طور پر وہاں دین بھی نہ ہوگا۔

روزہ اصلاً ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن اس کو ایک مخصوص مہینے میں مقرر کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد انفرادی عمل میں اجتماعی پہلو کو شامل کرنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ روزے کے مہینے میں ایک اجتماعی فضا پیدا ہو۔ ہر جگہ کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی عبادت میں مشغول ہوں اور ہر جگہ کے لوگ ایک ہی عبادت کا چرچا کریں، ہر جگہ کے لوگ اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کریں۔ روزہ اگر حقیقی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے تو اس کا انعام اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں، اس میں دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اضافہ اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ کس صائم کا روزہ کیفیت کے اعتبار سے کتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ عبادت کا اصول یہ ہے کہ — جتنی زیادہ کیفیت، اتنا زیادہ اجر۔

ایمان اور عمل

ایمان کے بارے میں علما کا یہ اتفاق ہے کہ ایمان دو چیزوں کا نام ہے— زبان سے اقرار کرنا، اور دل سے تصدیق کرنا (الإیمان: اقرار باللسان، وتصدیق بالقلب)۔ اِس مسئلے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قولی اقرار اور قلبی تصدیق، دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ قلبی تصدیق کے خارجی اظہار ہی کا دوسرا نام قولی اقرار ہے۔ اِس اعتبار سے، ترتیب میں قلبی تصدیق پہلے ہے اور قولی اقرار اس کے بعد۔ یہ قلبی تصدیق کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس قلبی تصدیق کے ساتھ معرفت جڑی ہوئی ہے۔ جب آدمی معرفت کے درجے میں اللہ کو دریافت کرتا ہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس کا قلب اس کی تصدیق کرنے والا بن جاتا ہے۔ اور جب قلب تصدیق کرتا ہے تو اس کے بعد لازماً یہ ہوتا ہے کہ اس کی زبان پر کلمہ کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ معرفت کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس معرفت کا تعلق اللہ رب العالمین سے ہے۔ جو آدمی معرفت کے درجے میں اللہ کو دریافت کرے، اُس نے گویا کہ اپنے خالق کو دریافت کیا۔ اُس نے اُس برتر ہستی کو دریافت کیا جو اس کا مالک ہے، جو دینے والا اور چھیننے والا ہے، جس کے سامنے آدمی اپنے تمام اعمال کے لیے جواب دہ (accountable) ہے، جو خالق ہونے کے علاوہ، آدمی کا محاسب اور مُجازی بھی ہے، جس کی گرفت سے انسان کسی حال میں بچ نہیں سکتا، جو دنیا اور آخرت کا واحد مالک ہے۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھئے تو یہ بات ایک غیر متعلق بات قرار پاتی ہے کہ عمل، ایمان کے اندر داخل ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل، ایمان کا ایک لازمی حصہ ہے جس کو ایمان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس آدمی کو معرفت والا ایمان حاصل ہو، اس کے لیے ایمان ایک انقلاب کے ہم معنی ہوگا، ایمان اس کی پوری زندگی کو بدل دے گا۔ اُس کی نیت، اس کی سوچ، اس کی گفتگو، اس کا سلوک، ردوقبول کے بارے میں اُس کا معیار، سب کچھ یکسر بدل جائے گا۔ ایسے آدمی کے لیے ایمان اور عمل دو چیز نہیں، ایسے آدمی کے لیے ایمان گویا کہ ایک بیج ہے اور عمل اُس بیج سے نکلا ہوا درخت۔

ربوبیت کا نظام

قرآن میں اللہ کو رب العالمین بتایا گیا ہے۔ رب یا ربوبیت کا مطلب ہے: **إنشاء الشيء حالا فحالا إلى حدّ التمام (المفردات للراغب)** یعنی کسی چیز کی پرورش کرکے اس کو درجہ بدرجہ کمال تک پہنچانا۔ قرآن میں رب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کو بتاتا ہے، اُس کا کوئی تعلق انسان کے قائم کردہ نظام سے نہیں ہے۔

قرآن کی سورہ المومنون کی چند آیتیں یہ ہیں: **ولقد خلقنا الإنسان من سُلالة من طين۔ ثم جعلناه نطفةً في قرار مكين۔ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغةً فخلقنا المضغة عظاماً فكسونا العظام لحماً، ثم أنشأناه خلقاً آخر، فتبارك الله أحسن الخالقين** (14-12 :23)۔ یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی۔ پھر جنین کو ہم نے گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پھر ہم نے لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔

قرآن کی اِن آیتوں میں ربوبیت کی وہ مثال بتائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست طور پر خود تخلیق کے عمل میں شامل کردی ہے۔ اِس ربوبیت کے ظہور میں انسان کا کوئی حصہ نہیں۔ اِس طرح کی تخلیقی ربوبیت کا معاملہ پوری کائنات میں جاری ہے۔ اِس ربوبیت کا تعلق انسان کے وجود سے بھی ہے اور دوسری اشیا کے وجود سے بھی۔

ربوبیت الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو فطرت کے قانون کے تحت اپنے آپ ظہور میں نہیں آتی، بلکہ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف صورتوں میں انسان کو توفیق دیتا ہے اور اللہ کی توفیق سے انسان اس میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ اِس معاملے کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ

فطرت میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں بطور امکان رکھی ہیں۔ آدمی اللہ کی توفیق سے، اِن امکانات (potentials) کو واقعہ (actual) بناتا ہے۔

تہذیب (civilization) کا ارتقا اِسی دوسری ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے۔ تہذیب کے تمام اجزا امکان کی صورت میں فطرت میں موجود تھے۔ اللہ کی توفیق سے انسان نے اِن امکانات کو واقعہ بنایا۔ اِس طرح ایک تدریجی عمل (gradual process) کے ذریعے موجودہ تہذیب وجود میں آئی۔

مثلاً انسان کی ایک ضرورت اپنے وجود کی توسیع ہے۔ اِسی توسیع کا ایک ذریعہ وہ ہے جس کو سفر کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں یہ کیا کہ اس نے انسان کو دو پاؤں دئے جس کے ذریعے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ سکے۔ پھر جنگل میں اونٹ اور گھوڑے اور خچر جیسے حیوانات پیدا کئے جن کو پکڑ کر انسان سدھائے اور پھر اُن کو اپنی سواری (vehicle) کے طور پر استعمال کرے۔ اِس طرح، اللہ کی توفیق سے انسان نے کشتی بنائی اور اِس طرح وہ پانی کو اپنی گزرگاہ کے طور پر استعمال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر انسان نے اللہ کی توفیق سے پہیہ (wheel) بنایا۔ اِس سے انسان کے لیے بری سفر کا نیا دور شروع ہوگیا۔ اِس کے بعد اللہ کی توفیق سے انسان نے فطرت کی کچھ اور طاقتیں دریافت کیں جس سے تیز رفتار مشینی سواریاں وجود میں آئیں۔ مثلاً ریل اور کار اور ہوائی جہاز، وغیرہ۔

سفر کے تیز رفتار ذرائع اور دوسری ترقیاتی چیزیں، جن کا تعلق تہذیب سے ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انسان کو حاصل ہوئیں۔ اِس اعتبار سے، تہذیب کا پورا معاملہ الٰہی ربوبیت کا ایک حصہ ہے۔ تہذیب کا ارتقا بظاہر انسان کے ذریعے ہوا، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تمام تر اللہ کی توفیق سے انجام پایا۔ اللہ کی خصوصی توفیق کے بغیر انسان، فطرت کی اُن دریافتوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا جن کے نتیجے میں تہذیب کا واقعہ ظہور میں آیا۔

انسان اور نظامِ ربوبیت

انسان ایک مکمل وجود ہے، مگر اِسی کے ساتھ وہ مکمل طور پر ایک غیر مکتفی وجود ہے۔ انسان کو اپنے وجود کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ ایک مددگار نظام درکار ہے۔ اِس نظام کے بغیر وہ اپنے وجود کو باقی

نہیں رکھ سکتا۔ اِسی مددگار نظام کا نام نظامِ ربوبیت ہے، یعنی رب العالمین کا قائم کردہ نظام۔

انسان کے اندر نظامِ ہضم ہے، مگر غذائی اشیا کی سپلائی باہر سے ہوتی ہے۔ انسان کے اندر نظامِ تنفس ہے، مگر آکسیجن اس کو خدا کے کارخانے سے ملتا ہے۔ انسان کے پاس نظامِ بصارت ہے، مگر وہ روشنی خدا کی طرف سے آتی ہے جس کے بغیر وہ دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس نظامِ سماعت ہے، مگر اُس ہوا کو چلانے والا خدا ہے جس کے بغیر انسان سن نہیں سکتا، وغیرہ۔ انسانی وجود کے اندر اِس قسم کے بہت سے نظام ہیں، مگر ہر نظام اپنی کارکردگی کے لیے خارجی مدد کا محتاج ہے۔ یہ مختلف قسم کے خارجی نظام جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے، اس کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ یہ لائف سپورٹ سسٹم نہ ہو تو انسان کا پورا وجود بے معنی ہو جائے گا۔

مچھلی پانی کے باہر مسلسل تڑپتی رہتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہے اور مچھلی صرف پانی سے آکسیجن لے سکتی ہے۔ مچھلی کی یہ مثال ہر آدمی کے لیے بہت زیادہ سبق آموز ہے۔ ہر وقت انسان کو سوچنا چاہئے کہ خدا اگر لائف سپورٹ سسٹم یا بالفاظ دیگر اپنے نظامِ ربوبیت کو واپس لے لے تو میرا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ اگر آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائے تو یہی ایک بات اس کے اندر تمام اعلیٰ قدروں (values) کو پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ مثلاً تواضع (modesty)، شکر، عفو و درگزر، خیر خواہی، انصاف، وغیرہ۔

شکر کے دو درجے

اِس دنیا میں انسان کو اپنے وجود سے لے کر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) تک جو چیزیں ملی ہیں، وہ سب کا سب اللہ کا عطیہ ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پورے دل و جان کے ساتھ اِن انعامات کے منعم (giver) کا اعتراف کرے۔ خدا کے اِسی اعتراف کا مذہبی نام 'شکر' ہے۔ اِس شکر یا اعتراف کے دو درجے ہیں — ایک ہے، نارمل اعتراف (normal acknowledgement)، اور دوسرا ہے، تخلیقی اعتراف (creative acknowledgement)۔ نارمل شکر کی مثال یہ ہے کہ آپ کو پیاس لگی۔ آپ نے

گلاس میں پانی لے کر اس کو پیا۔ اِس سے آپ کو سیرابی حاصل ہوئی اور پھر آپ نے کہا کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھ کو پانی دیا جس سے میں اپنی پیاس بجھاؤں۔

تخلیقی شکر کی مثال یہ ہے کہ آپ نے جب پانی پیا تو آپ کو پانی کی وہ پوری تاریخ یاد آگئی جو جدید سائنس نے دریافت کی ہے، یعنی تقریباً 15 بلین سال پہلے وسیع خلا میں بے شمار ستارے (stars) وجود میں آئے۔ پھر ایک عرصے کے بعد لٹل بینگ (little bang) ہوا، جس سے موجودہ نظامِ شمسی وجود میں آیا۔ اِس کے بعد زمین کی سطح پر بہت بڑی مقدار میں ہائڈروجن گیس اور آکسیجن گیس کے بادل چھا گئے، پھر دو گیسوں کے ملنے سے وہ استثنائی چیز وجود میں آئی جس کو ''پانی'' کہا جاتا ہے۔ پھر یہ پانی سمندروں میں کھاری پانی کی حیثیت سے جمع ہو گیا، پھر بارش کے نظام کے تحت، اِس کھاری پانی کا ازالۂ نمک (desalination) ہوا۔ اِس طرح ہمیں وہ میٹھا پانی حاصل ہوا جس سے ہم اپنی پیاس بجھائیں اور دوسرے کام کریں۔ مثلاً زراعت، وغیرہ۔

پانی کے معاملے میں پہلی صورت نارمل شکر کی ہے اور دوسری صورت تخلیقی شکر کی۔ دوسرے الفاظ میں، پہلا شکر اگر صرف شکر ہے تو دوسرا شکر برتر شکر — شکر اور برتر شکر کا یہی معاملہ دوسری تمام چیزوں کے بارے میں پیش آتا ہے۔

اِسی طرح اِس معاملے کی ایک مثال خون (blood) ہے۔ انسان جو غذا اپنے جسم میں داخل کرتا ہے، وہ ایک پیچیدہ نظام کے تحت خون میں تبدیل ہوتی ہے، پھر یہ خون ایک اور پیچیدہ نظام کے تحت سارے جسم میں رگوں کے ذریعے مسلسل دوڑتا ہے۔ یہ بلاشبہہ ربوبیت کے نظام کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ خون کا بننا، خون کا مسلسل گردش کرنا اور خون کی صفائی کا انتظام، وغیرہ۔ یہ سب چیزیں انسان کو خدا کی نعمتیں یاد دلاتی ہیں اور وہ اللہ کے لیے سراپا شکر میں ڈھل جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں خون کا تصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک سرخ سیال ہے جو جسم کی طاقت بن کر جسم کے اندر گردش کرتا رہتا ہے۔ پھر یہ دریافت ہوئی کہ خون دو قسم کے ذرات سے مل کر بنتا ہے — سرخ ذرات (red blood corpuscles)، اور سفید ذرات (white blood corpuscles)۔

اب یہ دریافت ہوئی ہے کہ خون میں اِس کے سوا، ایک اور خورد بینی ذرہ ہوتا ہے۔ اس کو پلیٹ لیٹس (platelets) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تیسرا ذرہ انسان کی زندگی اور صحت کے لیے بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خون ہر اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اِس نعمت کا احساس آدمی کے اندر شکر و حمد کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

اِس قسم کے بے شمار انتظامات ہیں جن کے اوپر انسان کی زندگی قائم ہے۔ یہ نظام براہِ راست خدا کی قدرت کے تحت قائم ہے اور اِسی کو قرآن میں ربوبیت کہا گیا ہے۔ یہ نظامِ ربوبیت تمام تر اللہ کی جانب سے قائم ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ربوبیت کے اِس نظام سے واقفیت حاصل کرے اور پورے معنوں میں اللہ کا شاکر بندہ بن کر اِس دنیا میں رہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رب صرف اللہ ہے اور اُسی کی ربوبیت اِس دنیا میں قائم ہے۔ اِسی طرح فرمایا کہ حکم صرف اللہ کا ہے اور تمام چیزیں اُسی کے زیرِ حکم ہیں۔ یہ دونوں الفاظ (رب اور حکم) اللہ کی ذات کی نسبت سے قرآن میں آئے ہیں، اس کا کچھ بھی تعلق سیاسیات یا معاشیات سے نہیں ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ انھوں نے مذکورہ الفاظ قرآن سے لئے اور اس کے اندر اپنے خود ساختہ مفہوم کو شامل کر دیا۔ یہ گویا کہ 'رب' اور 'حکم' کے لفظ کو سیاسی بنانا (politicisation) تھا۔ قرآنی الفاظ میں اِس قسم کا خود ساختہ مفہوم شامل کر کے انھوں نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان کا یہ مشن ہے کہ وہ دنیا میں نظامِ ربوبیت یا نظامِ حاکمیت قائم کرے۔ یہ بلاشبہہ ایک غیر علمی بات ہے۔ اس کی غلطی اتنی زیادہ واضح ہے کہ وہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہے۔

پٹنہ (بہار) میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز کتابیں اور ماہ نامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

A. H. M. Danyal
(President, Centre for Peace)
Mahatwana, Phulwarisharif
Patna-601505, Bihar
Mob. 09308477841, 09852208744

تمکین فی الارض

قرآن کی سورہ النور کی ایک آیت میں ایک اہم تاریخی اصول بتایا گیا ہے۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں کہ اللہ اُن کو زمین میں استخلاف عطا کرے گا، جیسا کہ اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو استخلاف عطا کیا تھا۔ اور ان کے لیے اُن کے اُس دین کو تمکین عطا کرے گا جس دین کو اللہ نے اُن کے لیے پسند کیا ہے۔ اور اُن کی خوف کی حالت کے بعد اُس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو وہ میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں''۔ (24:55)

قرآن کی اِس آیت میں ''تمکین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تمکین کا مطلب قدرت دینا (strengthening) ہے۔ اِس قدرت یا تمکین سے کیا مراد ہے، اُس کا ذکر خود قرآن کی مذکورہ آیت میں موجود ہے۔ آیت کے مطابق، وہ قدرت یا تمکین یہ ہے کہ دین کے معاملے میں خوف کی حالت ختم ہو جائے اور امن کی حالت قائم ہو جائے۔ اہلِ ایمان کو یہ موقع مل جائے کہ وہ شرک سے محفوظ ہو کر اللہ کی مطلوب عبادت کر سکیں۔ 'استخلاف فی الارض' سے مراد اِسی قسم کی تمکین ہے۔ اِس آیت میں استخلاف یا تمکین سے مراد کسی قسم کا قومی غلبہ یا سیاسی اقتدار نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد وہ موقع ہے جب کہ ایک مومن کو آزادانہ طور پر عابدانہ زندگی گزارنا ممکن ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ اِس آزادی کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ اجتماع کی سطح پر کوئی کامل نظام قائم ہو جائے۔ اِس لیے نظام یا سیاسی اقتدار کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول رکھا ہے کہ حالات کے تحت کبھی ایک گروہ کو سیاسی اقتدار ملے اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **تلك الأيام نداولها بين الناس** (3:140)

اللہ کی یہ سنت مجموعی نظام یا سیاسی اقتدار کے بارے میں ہے، مگر جہاں تک افراد کا تعلق ہے،

اُن کے بارے میں یہ مطلوب ہے کہ ان کو ہر حال میں یہ موقع حاصل رہے کہ وہ خدائے واحد کی آزادانہ عبادت کریں اور پُر امن دعوت الی اللہ کو کسی رکاوٹ کے بغیر ہر حال میں جاری رکھ سکیں۔ اِس لیے اللہ نے اِس سلسلے میں یہ اصول اختیار کیا ہے کہ وہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں قوموں کو ایک حد تک آزادی دئے ہوئے ہے، لیکن اللہ نے کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ عبادت اور دعوت الی اللہ کے کام میں غیر ضروری رکاوٹ پیدا کرے۔ جب بھی کوئی گروہ اِس قسم کی غیر ضروری رکاوٹ ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ تاریخ میں مداخلت کرکے اِس غیر ضروری رکاوٹ کو ختم کر دیتا ہے، تاکہ آزادانہ عبادت اور پُر امن دعوت کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں فتنہ (جارحانہ شرک) کو ختم کرنے کے لیے اصحابِ رسول کو قتال کا حکم دینا اِسی مصلحت کے تحت تھا (39 :8)۔ بیسویں صدی عیسوی میں یہی کام ایک اور صورت میں انجام پایا ہے۔ سوویت یونین (کمیونسٹ جبر) دوبارہ دعوت اور عبادت کے معاملے میں اِسی قسم کی ایک رکاوٹ بن گیا تھا، اللہ نے اس کو امریکا کے ذریعے 1991 میں توڑ دیا۔

استخلاف یا تمکین کا مطلب حکومت الٰہیہ کا قیام نہیں ہے۔ استخلاف کا تعلق دراصل خدا کی سنتِ امتحان سے ہے۔ اِس سنتِ امتحان کا ایک پہلو وہ ہے جو فرد سے متعلق ہے، دوسرا وہ ہے جو قوم سے متعلق ہے۔ جس طرح افراد کو اُن کے انفرادی دائرے میں کوئی چیز دے کر اُنھیں جانچا جاتا ہے، اُسی طرح قوموں کو باری باری اقتدار دیا جاتا ہے، تاکہ اُنھیں جانچا جائے (6: 165)۔

استخلاف بمعنی زمینی اقتدار کا تعلق اگر لازماً ایمان اور عملِ صالح سے ہو، تو تمام نبیوں کو زمینی اقتدار حاصل ہونا چاہئے تھا، جب کہ معلوم ہے کہ پچھلے نبیوں میں سے صرف دو نبیوں کو زمینی اقتدار ملا، یعنی حضرت داؤد اور حضرت سلیمان۔

اِسی طرح تمکین سے مراد تمکینِ سیاسی نہیں ہے، بلکہ تمکینِ دینی ہے، یعنی فرد کی نسبت سے دینی ذمے داری ادا کرنے کے لیے جو مواقع درکار ہیں، اُن مواقع کی پوری آزادی۔ فرد کی دینی ذمے داری بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں — آزادانہ عبادت، پُر امن دعوت۔ سیاسی اقتدار کے محدود دائرہ میں

اگر کوئی غیر مسلم حکمراں ہو، لیکن پُر امن دعوت اور آزادانہ عبادت کے معاملے میں اہلِ ایمان کو پورے مواقع حاصل ہوں تو کہا جائے گا کہ ایسے مقام پر اہلِ ایمان کو تمکین حاصل ہے— موجودہ زمانے میں تمام جمہوری ملکوں میں اہلِ ایمان کو پوری طرح یہ مواقع حاصل ہیں۔ اِس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانے کے جمہوری ملکوں میں وہ چیز عملاً حاصل ہے جس کو قرآن میں 'تمکین فی الارض' کہا گیا ہے۔

قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کو مصر میں تمکین (12: 21) عطا کی۔ یہ تمکین واضح طور پر غیر سیاسی تھی۔ خود قرآن سے یہ ثابت ہے کہ مصر میں حضرت یوسف کا معاصر غیر مسلم حکمراں بدستور تختِ اقتدار پر تھا اور ملک میں اُسی کا شاہی قانون (12: 76) رائج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا تعلق صرف انتظامِ ملکی سے ہے، اُس کا براہِ راست طور پر نجاتِ آخرت سے کوئی تعلق نہیں۔

دعوتی مقصد کے لیے مشرقی یوپی، خاص طور پر لکھنؤ اور اطراف کے قارئین، حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

Hafiz Mohammad Salman Noori
Madrasa S. Umar Farooq
Chawk, Lucknow-226 003
Mob. +91-9839801027
E-mail: msuflko@gmail.com

الرسالہ مشن کا مقصد مثبت سوچ اور خدا رخی زندگی کی تعمیر ہے۔ الرسالہ مشن کے ذریعے آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی واقع ہوئی، ہم آپ کی زبان میں اس کو مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ اِس سلسلے میں اپنے تجربات اور واقعات، نام و پتہ وغیرہ کی مکمل تفصیل کے ساتھ، ہم کو واضح اور متعین انداز میں لکھ کر روانہ فرمائیں:

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083, 46521511
E-mail: znadwi@yahoo.com

قرآن کا تصورِ تاریخ — ایک جائزہ

انسائکلوپیڈیا برٹینکا میں حسب ذیل عنوان کے تحت ایک مقالہ چھپا ہے: (Historiography and Historical Methodology) اِس مقالے میں ایک ذیلی عنوان (Muslim Historiography) قائم کیا گیا ہے۔ اِس کے تحت مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ — محمد نے اسلام کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جس میں تاریخ کا طاقت ور تصور موجود تھا۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن انتباہات سے بھرا ہوا ہے جو کہ تاریخ کے اسباق سے ماخوذ ہے:

Muhammad made Islam a religion with a strong sense of history. The Quran, Islam's holy book, is full of warnings derived from the lessons of history. (EB. 8/959, 1974)

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس سے قرآن کا تصورِ تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں شاہی خاندان (dynasty) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جاتی تھی۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون (وفات: 1406) کے بعد ایک نیا دور آیا، جب کہ نیشن (nation) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جانے لگی۔ اس کے بعد آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے بارہ جلدوں میں ایک کتاب (*A Study of History*) لکھی۔ اِس میں تہذیب (civilization) کو یونٹ بنا کر پوری انسانی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

قرآن کا تصورِ تاریخ اِن سب سے مختلف ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کا تصورِ تاریخ خدائی منصوبہ (divine plan) پر مبنی ہے، یعنی خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں انسانی تاریخ کا جائزہ لینا۔ زیرِ نظر مقالے میں اِس قرآنی تصور کے مطابق، تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس جائزے کے لیے بنیادی طور پر 9 ذیلی عنوانات مقرر کیے گیے ہیں — خلافتِ آدم، اعلان و اِسرار، ذبحِ عظیم، احسن القصص، مقامِ محمود، آیتِ اسرا، اظہارِ دین، لوحِ محفوظ، ادخالِ کلمہ۔

جنتی افراد، جنتی معاشرہ

قرآن کی سورہ الذاریات کی ایک آیت یہ ہے: **وما خلقتُ الجن والإنس إلا**

لیعبدون (51:56) یعنی میں نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ صحابی مفسر عبداللہ بن عباس نے اِس آیت میں 'لیعبدون' کی تشریح 'لیعرفون' سے کی ہے، یعنی جنات اور انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی معرفت (realization) حاصل کریں۔

معرفت کا تعلق فرد سے ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فرد ہی کا ذہن ہے جو اِس موضوع پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر اس کا ذہن اُس فکری واقعے کا تجربہ کرتا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالق کے منصوبے کے مطابق، تخلیق کا نشانہ یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے ہوں۔ اِس کے مطابق، تخلیق کا نشانہ افراد ہیں، نہ کہ کوئی مجموعہ یا نظام۔

تخلیق کا نشانہ وہی چیز ہوسکتی ہے جو فی الواقع قابلِ حصول ہو۔ اِس پہلو سے انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں بلاشبہہ ایسے افراد پیدا ہوئے جو عارف باللہ (realized person) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے برعکس، اگر مقصدِ تخلیق کو اجتماعی معنوں میں لیا جائے، مثلاً صالح معاشرہ بنانا، عادلانہ نظام کی تشکیل، عالمی سطح پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام، زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین کا نفاذ، وغیرہ۔ اِس طرح کے اجتماعی انقلاب کو برپا کرنا اگر تخلیق کا نشانہ ہو، تو وہ پوری تاریخ بشری میں کبھی معیاری معنوں میں وقوع میں نہیں آیا، نہ انبیا کے زمانے میں اور نہ انبیا کے زمانے کے بعد۔

آدم کی تخلیق سے لے کر اب تک انسانی تاریخ پر بہت لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔ اِس پوری مدت میں، انبیا یا پیروانِ انبیا کے ذریعے مسلسل طور پر یہ کام ہوتا رہا کہ تخلیق کا منصوبہ پورا ہو۔ یہ لوگ اللہ کے نمائندے تھے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ضرور مدد کرتا ہے، نہ صرف آخرت میں بلکہ موجودہ دنیا میں بھی (40: 51)۔ اِس طرح کی قرآنی آیات کی روشنی میں ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ انبیا اور اُن کے پیروؤں کا مشن یقینی طور پر کامیاب ہوا۔

یہ ایک مسلّمہ واقعہ ہے کہ اِن حضرات کی کوششیں پورے انسانی مجموعہ یا نظام کی سطح پر کبھی معیاری معنوں میں کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ افراد کی سطح پر وہ ہمیشہ کامیاب ہوئیں۔ ہر زمانے میں اور ہر کوشش کے ذریعے ایسے افراد وجود میں آئے جو پورے معنوں میں عارف باللہ تھے، جنھوں نے

اپنی ذات کے اعتبار سے اللہ کو اپنا کنسرن بنایا، جو اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے اور جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی۔

اِس تاریخی تجربے کا تقاضا ہے کہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کی کامیابی کا معیار پورے مجموعۂ انسانیت (mankind) کو قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس کی کامیابی کا معیار افراد کو قرار دیا جائے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو خالق کا منصوبہ تخلیق آخری حد تک کامیاب نظر آئے گا۔ آدم سے قبل جنات پیدا کئے گئے تھے (15 :27)۔ جنات کی بڑی اکثریت اگر چہ سرکش بن گئی، لیکن قرآن کے مطابق، اُن میں شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد بھی پیدا ہوئے (72 :11)۔ اِس طرح انبیا کے زمانے میں اگر چہ یہ ہوا کہ انبیا کے مخاطبین کی بڑی اکثریت منکر بنی رہی، لیکن انھیں کے درمیان یہ واقعہ بھی ہوا کہ شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد پیدا ہوتے رہے۔ اِسی طرح ختم نبوت کے بعد دُعاۃ (داعیوں) کی کوششوں کے ذریعے بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ اگر چہ نظام یا مجموعہ انسانیت کی سطح پر کبھی کامل معنوں میں صالح انقلاب نہیں آیا، لیکن شخصی سطح پر ہر دور میں بلاشبہہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے تھے۔

اسلام کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دور ہیں، قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد۔ قیامت سے پہلے کا دور برائے امتحان ہے اور قیامت کے بعد کا دور برائے انجام۔ یہ دونوں دور خالقِ کائنات کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں دور یکساں طور پر پوری طرح کامیاب دور ہوں۔ یہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کا کمتر اندازہ (underestimation) ہوگا کہ کامیابی کے اعتبار سے دونوں دوروں میں فرق کیا جائے۔ اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں دوروں کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دور کو انتخابِ افراد کا دور (period of individual selection) قرار دیا جائے اور دوسرے دور کو اقامتِ سماج (establishment of society) کا دور کہا جائے، یعنی پہلے دور میں اس اعلیٰ سماج کے لئے مستحق افراد (deserving individuals) کا انتخاب اور دوسرے دور میں پوری تاریخ کے ان مشترک افراد کو یکجا کر کے ان کی بنیاد پر ایک اعلیٰ معاشرہ (high society) بنانا۔

انسانی حیات کا یہی وہ دوسرا دور ہے جس کو قرآن میں جنت کہا گیا ہے۔

خلافتِ آدم

قرآن کے مطابق، انسانیت کا آغاز آدم اور حوا کی تخلیق سے ہوا۔ آدم پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق، انسان کی پیدائش سے پہلے سیارۂ ارض پر ایک ناری مخلوق جنات کو بسایا گیا تھا (15:27)۔ یہ غالباً اُس وقت کی بات ہے جب کہ زمین ابھی گرم حالت میں تھی۔ اِس کے بعد جب زمین ٹھنڈی ہوئی اور یہاں کے سمندروں میں پانی بھر گیا تو اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے خلافتِ ارضی کا فیصلہ کیا۔ اِس لحاظ سے انسان، خلیفۃ الجن ہے۔ روایات کے مطابق، جنات نے زمین پر فساد برپا کیا، اِس لیے زمین کا چارج جنات سے چھین لیا گیا اور اس کو انسان کے حوالے کیا گیا۔ اِسی معاملے کو قرآن میں ''خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے بسایا گیا ہے، لیکن یہ آزادی ایک مشروط آزادی ہے۔ اِس کے مطابق، موجودہ زمین انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے، وہ انسان کے لیے عیش گاہ نہیں۔ اِس معاملے کی ایک عملی مثال ابلیس اور ملائکہ کی صورت میں قائم کردی گئی ہے۔ جو لوگ ملائکہ کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر کردیں، وہ قیامت کی عدالت میں کامیاب قرار پائیں گے، اور جو لوگ ابلیس کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر نہ کریں، وہ قیامت کی عدالت میں ناکام قرار دئے جائیں گے۔ انسان کا یہ امتحان خود انسان کی سطح پر ہے، جیسا کہ ابلیس اور ملائکہ کے معاملے میں پیش آیا۔ اِس معاملے سے انسان کو ہر زمانے اور ہر نسل میں باخبر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ یہ پیغمبر لوگوں کی اپنی زبان میں صراطِ مستقیم کی وضاحت کرتے رہے۔ یہ پیغمبر جو کچھ کہتے تھے، وہ اللہ کی وحی سے کہتے تھے۔ تمام پیغمبروں کا ایک ہی مشترک اصول تھا — نصح وخیر خواہی، یعنی اپنے مدعو کی یک طرفہ طور پر خیر خواہی، مدعو کی طرف سے پیش آنے والی کسی بھی زیادتی پر ردِّ عمل کا طریقہ اختیار کئے بغیر مثبت انداز میں اپنا پیغام دیتے رہنا۔

خدا اور فرشتوں کا مکالمہ

آدم کی تخلیق کے وقت خدا اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی

آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھائے آدمی کو سارے نام، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک، تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے''۔ (2: 30-32)

یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کیا بات تھی جس پر فرشتوں کو اشکال پیدا ہوا، اور بعد کو کیا چیز اُن کے علم میں آئی جس کے بعد اُن کا اشکال دور ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ابتدا میں فرشتوں نے آدمی کی نسل کو اس کے پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے لیا۔ اُن کو نظر آیا کہ جس طرح اختیار پاکر جنات کا گروہ سرکش بن گیا، اس طرح اختیار پانے کے بعد انسانی نسل بھی مجموعی طور پر سرکش بن جائے گی۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرے کے ذریعے انسانی نسل کے منتخب افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور آدم نے اِن منتخب افراد کا تعارف کرایا۔ اُس وقت فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ اگرچہ مجموعہ کے اعتبار سے انسانی نسل میں فساد آجائے گا، لیکن عمومی فساد کے باوجود ہر زمانے میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو فساد سے خالی ہوں اور اصلاح کے راستے پر چلنے والے ہوں۔ نسلِ انسانی کے اِنھیں منتخب افراد کو قرآن میں انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین (4: 69) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِس مظاہرے کے بعد فرشتوں کو اللہ کے تخلیقی منصوبے کا علم ہوا۔ فرشتوں نے جانا کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کا تعلق پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ اِس مجموعے کے استثنائی افراد سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جنت کی معیاری دنیا میں آباد کرنے کے لیے ایسے افراد درکار تھے جو مکمل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچائیں اور خدا کی زمین پر خدا کے مطیع بن کر رہیں۔ ایسے افراد صرف کھلی آزادی کے ماحول میں بن سکتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرکے اس کو کامل آزادی کے ماحول میں بسایا اور پھر فرشتوں کو مقرر کیا کہ وہ اُن استثنائی افراد کا ریکارڈ تیار کریں جو

دباؤ کے بغیر خدا کی معرفت حاصل کریں اور پھر اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کا پابند بنائیں۔ یہی استثنائی افراد اللہ کے مطلوب افراد ہیں۔ انھیں مطلوب افراد کا انتخاب کر کے اُن کو جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے گا۔

اعلان و اِسرار

حضرت آدم کے بعد ان کی نسل جس علاقے میں پھیلی، وہ غالباً وہی علاقہ تھا جس کو میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کہا جاتا ہے، یعنی دجلہ اور فرات کے درمیان کا زرخیز علاقہ۔ حضرت آدم کے بعد کئی نسلوں تک وہ درست حالت پر قائم رہے۔ پھر ان کے درمیان بگاڑ آیا۔ ان میں شرک پھیل گیا، یعنی خالق کے بجائے مخلوق کی پرستش کرنا۔ اِس کے بعد ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت نوح نے وحی کے ذریعے ان کو خدا اور آخرت کا پیغام دیا۔ ان کی کوشش سے ان کی قوم کی ایک محدود تعداد اُن پر ایمان لائی، لیکن قوم کی بڑی اکثریت سرکشی پر قائم رہی۔ حضرت نوح نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ — خدایا، میں نے اعلان کے ساتھ بھی کام کیا اور اسرار کے ساتھ بھی (71:9)۔

اِس آیت میں اعلان سے مراد قوم سے اجتماعی خطاب ہے، اور اِسرار سے مراد انفرادی سطح پر اُن کو نصیحت کرنا ہے۔ حضرت نوح نے لمبی مدت تک دونوں طریقے سے اپنا دعوتی مشن جاری رکھا، مگر قوم کی سرکشی ختم نہ ہو سکی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا طوفان بھیجا جس میں چند لوگ زندہ بچے جو حضرت نوح کی کشتی پر سوار تھے، بقیہ پوری قوم طوفان میں غرق ہو کر ہلاک ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اِس طوفان کے بعد حضرت نوح کے تین بیٹے زندہ بچے جن کا نام — حام، سام، یافث تھا۔ اِنھیں تین بیٹوں سے بعد کی انسانی نسل چلی اور پھر وہ دھیرے دھیرے پوری سطح ارض پر پھیل گئی۔ جب انسانی نسل زمین کے مختلف حصوں میں آباد ہوئی تو ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میں سے کسی فرد کو پیغمبر بنایا جس نے اپنی قوم کو خدائی صداقت کا پیغام دیا۔ مگر جو انجام ہوا، وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ لوگوں نے اپنے پیغمبروں کا مذاق اڑایا اور ان کو ماننے سے انکار کر دیا (36:30)۔

اِس عام گمراہی کا سبب لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ لوگ مخلوقات کو دیکھتے تھے، مگر خالق ان کو

نظر نہ آتا تھا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ مخلوقات میں سے جو چیز بظاہر بڑی دکھائی دی، اُسی کو انھوں نے اپنا معبود سمجھ لیا اور اس کو پوجنے لگے۔ مثلاً سورج اور چاند، وغیرہ۔ اِس عام گمراہی کی بنا پر ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی یا پیغمبروں کے مشن کی کوئی تاریخ ریکارڈ نہ ہوسکی۔ انسان نے جب لکھنا پڑھنا سیکھا تو اس نے اپنی تاریخ بھی لکھی، مگر اِن تاریخوں میں بادشاہوں اور جنرلوں کے واقعات لکھے گئے، مگر پیغمبروں کو یا ان کے مشن کو ناقابلِ ذکر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی بھی پیغمبر کا حوالہ مدوّن تاریخ (recorded history) میں موجود نہیں۔

تاہم موجودہ زمانے میں زمین کی کھدائی سے پیغمبروں کے دور کے کچھ آثار برآمد ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر کچھ پیغمبروں کے حالات مورخین نے تحریر کئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم انیسویں صدی عیسوی تک تاریخی شخصیت نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول (1922-1943) میں کھدائی (excavation) کے ذریعے عراق کا قدیم شہر اُر (Ur) دریافت ہوا جو کہ حضرت ابراہیم کا مقامِ عمل تھا۔ اِس کے بعد پیغمبر ابراہیم کو ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت سے مان لیا گیا۔

ذبحِ عظیم

ہزاروں سال تک پیغمبروں کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ضرورت تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خدائی مشن کی ایک تاریخ بنے۔ وہ انفرادی واقعات سے بڑھ کر ایک تہذیب (civilization) کی صورت اختیار کرلے۔ اِس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ بڑی تعداد میں ساتھی ملیں، جن سے ایک مضبوط ٹیم تیار ہو۔ یہ ٹیم جدوجہد کرکے صورتِ حال کو بدلے۔ وہ تاریخ میں ایک نیا دور لائے، جب کہ خدائی مشن ایک تہذیب کی صورت اختیار کرلے۔ اِس قسم کی مطلوب ٹیم بنانے کے لیے وہ واقعہ ہوا جس کو قرآن میں ذبحِ عظیم (37: 107) کہا گیا ہے۔

ہزاروں سال تک ایسا ہوا کہ پیغمبر آتے رہے، مگر بڑی تعداد میں قبولِ ایمان نہ کرنے کی وجہ سے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی ٹیم نہیں بنی۔ اِس کا سبب وہی چیز تھی جس کو ماحول کی کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اِس کنڈیشننگ کا ذکر حدیث میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: **کل مولود یولد علی الفطرة، فأبواه**

یهودانه، أویمجسانه، أوینصرانه (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 1385) یعنی ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔

اِس صورتِ حال کی بنا پر آبائی مذہب ایک سماجی رواج بن گیا تھا۔ اِس تسلسل کو توڑنے کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ ایک ایسی نئی نسل بنائی جائے جو اپنی فطری حالت پر قائم ہو اور پھر پیغمبر کی دعوت کو قبول کر کے وہ خدا پرست انسانوں کی ٹیم کا حصہ بن سکے۔

اِس مخصوص منصوبے کے تحت، حضرت ابراہیم نے یہ کیا کہ وہ اُس دور کے متمدن ملک عراق کو چھوڑ کر عرب کے صحرا میں آئے اور یہاں خالص صحرائی ماحول میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو آباد کیا۔ صحرائی ماحول میں آباد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ متمدن دنیا سے منقطع ہو کر ایک نسل بنے جو متمدن ماحول کی کنڈیشننگ (conditioning) سے پاک ہو۔

یہی وہ خصوصی منصوبہ تھا جس کے تحت حضرت ابراہیم کو یہ خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں (37: 102)۔ حضرت ابراہیم نے اِس معاملے کو اپنے بیٹے کے جسمانی ذبح کے ہم معنی سمجھا اور بیٹے کو لٹا کر اس کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اسماعیل کے جسمانی ذبیحہ سے روک دیا۔ اُس وقت فرشتے نے کہا کہ آپ بیٹے کے بجائے ایک دنبہ ذبح کر دیں اور بیٹے کو لے جا کر صحرا میں اُس مقام پر بسا دیں، جہاں آج مکہ آباد ہے۔

اِس واقعے کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: وفدیناہ بذبح عظیم (37: 107) یعنی ہم نے چھڑا لیا اسماعیل کو ایک بڑے ذبیحہ کے بدلے۔ یہاں بڑے ذبیحہ سے مراد صحرا کے غیر متمدن اور بے آب و گیاہ ماحول میں آباد ہونا تھا، جو کہ جسمانی ذبیحہ سے بلاشبہہ بہت زیادہ سخت تھا۔

اِس آیت میں ذبحِ عظیم (عظیم قربانی) کا لفظ اسماعیل کے لیے آیا ہے، نہ کہ دنبہ کے لیے۔ دنبہ کو حضرت ابراہیم نے بطور فدیہ ذبح کیا اور اسماعیل کو ایک عظیم تر قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ عظیم تر قربانی کیا تھی، وہ یہ تھی کہ اس کے بعد اسماعیل کو اپنی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کے صحرا میں آباد کر دیا گیا، تاکہ اُن کے ذریعے سے ایک نئی نسل تیار ہو۔ اُس وقت یہ علاقہ صرف ایک بے آب و گیاہ صحرا

کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں اسباب حیات میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی، اِس لیے اِس معاملے کو قرآن میں ذبحِ عظیم کا درجہ دیا گیا۔

احسن القصص

قرآن کی سورہ یوسف میں پیغمبر یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اِس واقعے کو قرآن کا احسن القصص (12: 3) بتایا گیا ہے۔ احسن القصص کا لفظی مطلب ہے — بہترین قصہ (best story) مگر قرآن میں یہ بات قصہ برائے قصہ کے طور پر نہیں آئی ہے، بلکہ وہ ایک اہم سبق (lesson) کے طور پر آئی ہے۔ ہر پیغمبر کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ حق کا داعی ہوتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ دعوت کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔ مختلف پیغمبر مختلف حالات میں آئے۔ اِس لحاظ سے یہ ہوا کہ مختلف پیغمبروں کے ذریعے مختلف قسم کی عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ اُنھیں میں سے ایک مثال یا ماڈل وہ ہے جو حضرت یوسف کے ذریعے قائم ہوا۔

حضرت یوسف کنعان (فلسطین) کے علاقے میں ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر جیسے متمدن ملک کے دارالسلطنت میں پہنچا دیا، جہاں ایک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ایسا غالباً اِس لیے ہوا کہ حضرت یوسف کے ذریعے دعوت کی جو مثال قائم کرنا مطلوب تھا، وہ مصر جیسے ملک ہی میں ممکن تھی۔ حضرت یوسف کے اِس واقعے کی تفصیل قرآن میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ اُس وقت کے مصری بادشاہ نے حضرت یوسف کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی۔ اِس پیش کش کو حضرت یوسف نے قبول کرلیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ بادشاہ اپنے مذہبی عقیدے کے اعتبار سے مشرک تھا۔ مزید یہ کہ سیاسی تخت بھی بدستور اُس کے قبضے میں تھا۔ اِس کے باوجود حضرت یوسف نے بادشاہ کے تحت ملنے والے اِس عہدے کو قبول کرلیا۔

قرآن کے مطابق، اِس کا سبب یہ تھا کہ خزائن ارض پوری طرح حضرت یوسف کو حاصل ہو رہے تھے۔ قدیم زمانے کے لحاظ سے، خزائن ارض کا مطلب تھا — سرزمین مصر کا زراعتی انتظام۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک مطلوب پیغمبرانہ ماڈل ہے کہ داعی اگر ایسے ملک میں ہو، جہاں

سیاسی اقتدار (political power) کسی اور کے ہاتھ میں ہو، لیکن یہ امکان ہو کہ اگر داعیٔ حق دوسرے کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلے تو اس کو کام کے مواقع بلا روک ٹوک حاصل ہو جائیں گے، تو اُس وقت حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ایسی پیش کش کو کھلے دل سے قبول کرلیا جائے۔

حضرت یوسف کے ساتھ یہ معاملہ اُس دور میں پیش آیا، جب کہ دنیا میں ہر جگہ زراعت کا دور (agricultural age) پایا جاتا تھا۔ کام کے مواقع تمام تر زراعت کے ساتھ وابستہ تھے۔ اُس وقت خزائنِ ارض کا مطلب تھا— خزائنِ زراعت۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ہم جمہوریت کے دور میں ہیں۔ اب سیاست کا ڈی سنٹرلائزیشن (de-centralization) ہو چکا ہے۔ اب انتظام (administration) کے سوا تمام شعبے ہر ایک کے لیے آزادانہ طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں حضرت یوسف کا ماڈل موجودہ حالات میں مکمل طور پر قابلِ انطباق (applicable) ہے۔ آج اگر داعیٔ حق، سیاسی حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرے تو کسی باضابطہ اعلان یا معاہدہ کے بغیر ہی تمام خزائن ارض، بہ الفاظ دیگر، تمام مواقع کار آزادانہ طور پر داعی کے زیر تصرف آجائیں گے۔ حضرت یوسف کے اِس ماڈل کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ حق کے داعی کو چاہئے کہ وہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں غیر نزاعی طریقِ کار (non-confrontational approach) اختیار کرے۔ اِس حکمت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ خزائنِ ارض پوری طرح اس کے استعمال میں آجائیں گے اور وہ پُرامن رہنے کی شرط پر دعوت کا کام اعلیٰ ترین معیار پر انجام دے سکے گا۔

حضرت یوسف کے واقعے کو قرآن میں احسن القصص کہا گیا ہے۔ یہ محض ایک قصے کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ ایک بہترین ماڈل ہے جس کو ایک پیغمبر کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف کا قصہ قرآن کے علاوہ، بائبل میں بھی تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ بائبل میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہِ مصر نے جب حضرت یوسف کو مصر کے خزائن پر مقرر کیا تو اس نے کہا:

Only in regard to the throne, I will be greater than you. (Genesis 37:50)

حضرت یوسف کی مثال کی روشنی میں اگر یہ متعین کیا جائے کہ اس کے مطابق، کام کا بہترین ماڈل کیا ہے، تو وہ ماڈل یہ ہوگا کہ بادشاہِ وقت سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرو۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ آپ غیر سیاسی دائرے میں موجود تمام مواقع کو آزادانہ طور پر حق کے مشن کے لیے استعمال کرسکیں گے۔ اِس ماڈل کا خلاصہ دولفظوں میں یہ ہے — سیاسی اقتدار کے معاملے میں موجودہ صورت حال کو تسلیم کرنا، اور سیاسی اقتدار کے باہر کے دائرے میں اپنے عمل کی تنظیم کرنا:

Political statusquoism, non-political activism.

مقامِ محمود

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے: **عسى أن يبعثك ربك مقاماً محموداً** (17:79) یعنی امید ہے کہ تمھارا رب تم کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس مقامِ محمود کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اِس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو آخرت سے پہلے موجودہ دنیا میں پیش آنا ہے۔ مقامِ محمود کے اِس دوسرے پہلو کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو استثنائی طور پر خود انسانی تاریخ کے مطابق، ایک مسلَّم نبوت (acknowledged prophethood) کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو پیغمبر دنیا میں آئے، ہمارے عقیدے کے اعتبار سے، وہ بلاشبہہ خدا کے پیغمبر تھے۔ مگر قدیم زمانے میں موافق اسباب نہ ہونے کی وجہ سے پچھلے پیغمبر قدیم تاریخی ریکارڈ میں درج نہ ہوسکے۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں پہلی بار وہ اسباب پیدا ہوئے جب کہ آپ کو آزاد تاریخی ریکارڈ میں ایک معلوم اور مسلّم شخصیت کے اعتبار سے درج کیا گیا۔ اِس تاریخی حقیقت کو ایک مستشرق نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — محمد تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب 570 میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بنو اسماعیل کے ایک فرد تھے۔ پچھلے تقریباً ڈھائی ہزار سال کے دوران عرب کے ماحول میں بنو اسماعیل کے نام سے ایک پوری نسل

تیار ہو چکی تھی۔ جس کے افراد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک مستشرق نے اس کو ہیروؤں کی نسل (a nation of heroes) کہا تھا۔ یہی وہ گروہ ہے جس میں دعوت و تربیت کا کام کر کے وہ جماعت تیار ہوئی جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے یہ کیا کہ انھوں نے ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اُن سے پہلے توحید کا عقیدہ صرف ایک نظریے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصحاب رسول کی غیر معمولی کوششوں سے وہ انقلاب کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ شرک کا دور ختم ہو گیا اور توحید کا دور پوری طاقت کے ساتھ شروع ہو گیا۔

اِسی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ تاریخ میں ایک نیا پراسس (process) شروع ہو گیا۔ اِس پراسس کا آغاز ساتویں صدی کے نصف اول میں عرب سے ہوا، اس کا اختتام (culmination) ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں ہوا۔ اس انقلاب کے بہت سے پہلو تھے۔ مثلاً اِس انقلاب نے اسلام کے عقیدے کو سائنسی حقیقت (scientific reality) کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس نے مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس کے بعد دعوت و تبلیغ کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں جدید کمیونیکیشن وجود میں آیا، جس کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کے پیغام کو عالمی سطح پر پہنچایا جا سکے۔ آفاق و انفس میں سائنس کی دریافتوں سے یہ ممکن ہو گیا کہ اعلیٰ ترین علمی معیار پر حق کی تبیین کی جا سکے (4:53)۔

آیتِ اسرا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور، یعنی ہجرت (622ء) سے ایک سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا، جس کو قرآن میں اسرا کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **سبحان الذي أسرىٰ بعبده ليلاً من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى الذي باركنا حولَه لنريه من آياتنا** (17:1)۔ اِس آیت میں اسرا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسرا کا لفظی مطلب ہے — رات کا سفر (night journey)۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی انتظام کے تحت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ رات کے ایک لمحے میں آپ نے مکہ سے یروشلم کا سفر کیا، اور پھر آپ اسی رات کو یروشلم (فلسطین) سے مکہ واپس آئے۔ اِس سفر کی مجموعی مسافت تقریباً 25 سو کلومیٹر تھی۔

اِس سفر کا مقصد قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: لنریہ من ایاتنا یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں پیغمبر کو دکھانا۔ یہ نشانیاں (آیات اللہ) کیا تھیں، وہ یروشلم کی عمارتیں یا وہاں کے درخت اور چشمے نہ تھے۔ وہ نشانی دراصل فطرت میں چھپا ہوا وہ امکان تھا جس کو تیز رفتار سفر اور تیز رفتار پیغام رسانی کہا جاتا ہے، یعنی آنے والا دورِ مواصلات (age of communication)۔ اِس تجربے کے ذریعے پیغمبر اسلام کو بتایا گیا کہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہو جائیں گے جن کی مدد سے عالمی سطح پر خدا کے آخری دین کی اشاعت ممکن ہو جائے، یعنی وہی واقعہ جس کو حدیث میں 'ادخال الكلمة في كل البيوت' (ہر گھر میں کلمۂ اسلام کا داخلہ) کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرا کے واقعے کی صورت میں جو تجربہ کرایا گیا، وہ مستقبل کے بارے میں ایک بشارت تھی۔ اِس بشارت کا ذکر احادیث میں مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام نے فرمایا: و ليتمنّ اللهُ هٰذا الأمر حتى يسير الراكب من صنعاء إلى حضرموت، ما يخاف إلّا الله (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3852) یعنی اللہ ضرور اِس امر (دین) کو تکمیل تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضرت موت تک جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔ اِس سلسلے میں ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے: ليبلغن هٰذا الأمرُ ما بلغ الليلُ و النهار (مسند احمد، رقم الحدیث: 17082) یعنی خدا کی قسم، یہ امر (دین) ضرور وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک رات اور دن پہنچتے ہیں۔ اِسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں: لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمةَ الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث: 24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا، جہاں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو داخل نہ کر دے۔

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تیز رفتار کمیونکیشن کا تجربہ کرایا گیا تھا۔ مذکورہ احادیث میں پیشین گوئی کے انداز میں بتایا گیا ہے کہ یہ امکان ضرور مستقبل میں واقعہ بنے گا اور خدا کا دین جو عرب میں شروع ہوا، وہ گلوبل کمیونکیشن کے ذریعے سارے عالم میں پہنچ جائے گا، یہاں تک کہ کوئی بھی انسان اُس سے بے خبر نہ رہے۔

اظہارِ دین

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد 'اظہارِ دین' تھا۔ اظہارِ دین کی آیت قرآن میں تین بار آئی ہے (9: 33; 48: 28; 61: 9)۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں: **هو الذي أرسل رسولَه بالهُدىٰ و دين الحق ليظهره على الدين كلّه** (9:33) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو سارے دین پر غالب کردے۔ اِس آیت کی تفسیر کے تحت مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ — اظہارِ دین کا مطلب ہے حجت اور دلائل کے ذریعے دین کو غالب کرنا (أي **بالحجة و البراهين**، 8/121)۔

اظہارِ دین کے جس واقعے کا قرآن میں ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ رسول میں وہ پوری طرح واقع ہوجائے گا۔ اِس آیت میں ایک تاریخی تبدیلی کا ذکر ہے، اور تاریخ میں کوئی بڑی تبدیلی اچانک یا محدود مدت میں نہیں آتی، ایسی تبدیلی ہمیشہ لمبی مدت کے پراسس (process) کے بعد آتی ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کی جدوجہد سے ساتویں صدی کے نصف اول میں ایک انقلابی عمل شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف حالتوں سے گزرتا ہوا تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا اور پھر اس کے نقطۂ انتہا (culmination) کے طور پر وہ واقعہ اپنی کامل صورت میں پیش آیا جس کو قرآن میں 'ليظهره على الدين كلّه' کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔

حجت یا برہان کیا ہے۔ یہ ایک دوطرفہ عمل ہے، یعنی ایک طرف حجت کو پیش کرنے والا ہوتا ہے اور دوسری طرف حجت کو سننے والا۔ اِس لیے حجت کو مخاطب کے ذہنی تقاضے کے مطابق ہونا چاہئے۔ علمی استدلال دراصل اِس بات کا نام ہے کہ مخاطب کے علمی مسلّمہ پر اپنی بات کو ثابت کیا جائے۔ ساتویں صدی کے نصف اول میں جب کہ قرآن اترا، اُس وقت دنیا روایتی دور سے گزر رہی تھی۔ اُس وقت صرف روایتی استدلال ہی ممکن تھا۔ مگر قرآن ایک ابدی کتاب کی حیثیت سے اتارا گیا ہے، اس لیے قرآن کے مذکورہ الفاظ میں یہ بات شامل ہے کہ نہ صرف روایتی دور میں، بلکہ بعد کو ظہور میں آنے والے سائنسی معیار کے مطابق بھی قرآن مسلّمہ طور پر اپنی ایک ثابت شدہ کلام کی حیثیت کو برقرار رکھے گا۔

اِس مصلحت کا تقاضا تھا کہ انسانی علم کا ارتقا ایسے نہج پر ہو جو قرآن کی صداقت کو بعد کے دور میں بھی یکساں طور پر برقرار رکھے۔ یہی وہ مطلوب ہے جو بعد کے سائنسی دور میں حاصل ہوا۔ سائنس کی دریافتوں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کے نظریات کو دوبارہ سائنس کے معیار پر ایک مسلّمہ معیار کی حیثیت دے دی۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی موافقِ قرآن واقعہ ہے جس کی پیشگی خبر ان الفاظ میں دی گئی تھی: **سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق** (41:53)۔

قرآن کی اِس آیت میں آفاق وانفس کی جن نشانیوں کا ذکر ہے، اُس سے مراد وہی چیز ہے جس کو جدید سائنس کی دریافتیں (scientific discoveries) کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت دراصل فطرت میں قائم شدہ خدائی قانون کی دریافتیں ہیں۔ چوں کہ قرآن کو نازل کرنے والا جو خدا ہے، اُسی نے فطرت کے اِن قوانین کو بھی قائم کیا ہے، اِس لیے دونوں کے درمیان کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ اِس مطابقت نے حاملینِ قرآن کو موجودہ زمانے میں ایک یہ موقع دیا ہے کہ وہ قرآن کی صداقتوں کو سائنس کے مسلّمات کی روشنی میں ثابت شدہ بنا سکیں۔

قرآن میں اظہارِ دین کے جس واقعے کا ذکر ہے، اُس سے مراد یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ نزول میں یہ واقعہ عملاً پیش آجائے گا، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلاب آئے گا، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے پراسس کو شروع کرے گا۔ یہ پراسس عرب میں شروع ہوا اور بتدریج ارتقا کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اِس تکمیل کے ذریعے نہ صرف واقعاتِ فطرت ظہور میں آئے جنھوں نے اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے سائنسی بنیاد فراہم کی، بلکہ اِس کے ذریعے دوسرے وہ اجتماعی واقعات ظہور میں آئے جو اسلامی دعوت کے عین موافق تھے۔ مثلاً آزادی، جمہوریت اور مذہب کے اعتبار سے کھلا پن (openness)، وغیرہ۔

قرآن کی اِس آیت میں اظہار سے مراد سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد فکری غلبہ اور ایسے حالات کا پیدا ہونا ہے جس کے بعد قرآن کے مشن کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، ہر قسم کے مواقع اس کے لیے قابلِ استعمال ہو جائیں — اکیسویں صدی عیسوی میں، قرآن کی یہ پیشین گوئی عملاً

پوری طرح وقوع میں آچکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی اظہارِ دین کی صدی ہے۔ اسلامی انقلاب کے ذریعے جو تاریخی عمل (historical process) ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، وہ اکیسویں صدی میں اپنے آخری نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا ہے۔ اب اہلِ اسلام کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام دوسری چیزوں کو ثانوی (secondary) بنائیں۔ وہ دعوت الی اللہ، بہ الفاظ دیگر دورِ جدید کی نسبت سے قرآنی تعلیمات کی اشاعتِ عام کریں، یہاں تک کہ ہر عورت اور ہر مرد اس سے باخبر ہو جائے۔

لوحِ محفوظ

قرآن کی سورہ البروج میں یہ آیت آئی ہے: **بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ** (85: 21-22) یعنی وہ ایک باعظمت قرآن ہے، لوح محفوظ میں۔ اِس آیت میں لوحِ محفوظ (well-guarded tablet) کا مطلب کیا ہے۔ اِس سلسلے میں کوئی مستند حدیث موجود نہیں۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں ایک محفوظ لوح ہے اور اِس لوح پر قرآن کا متن لکھا ہوا ہے۔ یہ بات اصولاً درست ہے، لیکن لوح سے مراد معروف لوح نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد ربانی لوح ہے۔

اصل یہ ہے کہ پورا عالمِ موجودات مکمل طور پر اللہ کے امر کے تحت ہے۔ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں اور سیاروں کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا ایک مقرر کورس (determined course) ہے، اور وہ ادنیٰ انحراف کے بغیر اِس مقرر کورس پر چلتے ہیں (36: 38)۔ اِسی معاملے کو علمی طور پر اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عالمِ مادی، فطرت کے قانون (law of nature) کی پابند ہے، اور عالمِ حیوانات اپنی جبلت (instinct) کی پابند۔

انسان کا معاملہ بظاہر مختلف ہے، کیوں کہ انسان کو اپنے قول وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔ مگر اِس آزادی کے باوجود انسانی تاریخ پر اللہ نے اپنا کنٹرول قائم کر رکھا ہے۔ تاریخ پر اِسی کنٹرول کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن کے حوالے سے اِس طرح بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک لوح محفوظ میں ہے۔ لوحِ محفوظ کا معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے، مطالعہ کے ذریعے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن سے پہلے اپنے نبیوں کے ذریعے بہت سی کتابیں بھیجیں جو انسان کے لیے معتبر ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر پچھلی کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب آخری پیغمبر بھیج دیا جائے تو اِس فیصلے کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعے آئی ہوئی کتاب (قرآن) کی مستقل حفاظت کا انتظام کر دیا جائے — لوح محفوظ کے الفاظ میں قرآن کے اِسی مخصوص حفاظتی انتظام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس کی تدبیر یہ کی گئی کہ اولاً قرآن کا معیاری متن (standard version) علمِ الٰہی یا بہ الفاظِ دیگر، ملاءِ اعلیٰ میں محفوظ کر دیا گیا اور پھر تاریخ کے لیے مقدر کر دیا گیا کہ وہ اِس معاملے میں اِسی رخ پر سفر کرے۔ چناں چہ عملاً یہی ہوا۔ اولاً یہ ہوا کہ ساتویں صدی کے نصف اول میں قرآن کو حافظے سے کتابت کی صورت میں محفوظ کیا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے نسل در نسل یہ کیا کہ قرآن کو نہ صرف یاد کر کے اپنے حافظے میں ریکارڈ کر لیا، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ قرآن کے کتابت شدہ نسخے برابر تیار کرتے رہے۔ اِس طرح وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک مکتوب قرآن کو پہنچاتے رہے۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **علّم بالقلم**۔ تعلیم بالقلم کا یہ عمل اِس طرح مسلسل تقریباً ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ انسانوں کو یہ توفیق دی کہ وہ طباعت کے آلات ایجاد کریں۔ اِس فن کے ارتقا میں بہت سے انسانوں نے کام کیا۔ آخر کار جرمن گولڈسمتھ جوہانس گوٹن برگ (وفات: 1468) اِس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ایک قابلِ عمل طباعتی آلہ دریافت کرے۔ اِس دریافت کے بعد تاریخ میں ایک پرنٹنگ انقلاب (printing revolution) آیا جو تیزی سے ترقی کرتے ہوئے موجودہ اعلیٰ طباعتی مشین (printing press) تک پہنچا۔

لوح محفوظ کے الفاظ میں اِسی تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کا نزول 610 عیسوی میں شروع ہوا۔ اس کی تکمیل تقریباً 23 سال میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے استثنائی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ خدا کے نزدیک، قرآن کا جو معیاری متن (standard version) تھا، وہ ادنی تغیر کے بغیر پہلے انسانی حافظے میں ریکارڈ ہوا، پھر ادنیٰ تغیر کے بغیر کتابت کے ذریعے اس کی

جلدیں بنائی گئیں، پھر تاریخ میں ایک پراسس جاری ہوا جس کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس کا دور آ گیا۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں یہ ممکن ہوگیا کہ قرآن کا ایک نسخہ نہایت درست طور پر تیار کیا جائے اور پھر اس کی بلین اور بلین کاپیاں تیار کرلی جائیں۔ آج ہر گھر میں اور ہر مسجد میں اور ہر مدرسہ اور ہر لائبریری میں قرآن کے نہایت صحیح مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ اِس طرح خدا کی تقدیر اِس بات کی ضامن بن گئی کہ قرآن کسی بھی قسم کے تغیر اور تبدل کے بغیر ہر انسان کے لیے قابلِ دستیاب ہوجائے۔

ادخالِ کلمہ

سیکولر مبصرین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا سفر اس کے پیغمبر کے جلد ہی بعد ٹوٹ گیا، بعد کی تاریخ میں اسلام کا تسلسل باقی نہ رہا۔ مگر یہ رائے صرف سرسری مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اسلام خدا کا دین ہے۔ اسلام کی تاریخ خدائی منصوبے کے تحت مسلسل سفر کررہی ہے۔ غلط فہمی صرف اِس لیے ہوتی ہے کہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ تاریخ کا ہر سفر ناموافق حالات میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا سفر انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے جاری ہے، نہ کہ انسانی آزادی کو منسوخ کرکے۔ انسانی تاریخ میں اسلام کے سفر کے تین مرحلے ہیں:

Land expansion—consolidation—overseas expansion

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں اپنے مشن کا آغاز 610 عیسوی میں کیا۔ اِس کے بعد دینِ توحید کی ایک نئی تاریخ بنی۔ اِس تاریخ کا خلاصہ یہ تھا کہ — انسانی آزادی کو منسوخ کئے بغیر دینِ توحید کی تاریخ بنانا اور اس کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچانا۔ اس تاریخ پر اب تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ یہ تاریخ مسلسل طور پر اپنی منزل کی طرف سفر کررہی ہے۔ اِس مدت کے دوران بظاہر جو اتار چڑھاؤ کے واقعات نظر آتے ہیں، وہ انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے تاریخ کو مینیج (manage) کرنے کی مثالیں ہیں۔

قرآن کی سورہ الانعام میں بتایا گیا ہے کہ — یہ قرآن اِس لیے اتارا گیا ہے کہ تم اے پیغمبر، آگاہ کردو اہلِ مکہ کو اور مکہ کے اطراف کے لوگوں کو (6: 92)۔ قرآن کی اِس آیت میں، مکہ اور اطرافِ مکہ سے مراد بڑی حصۂ ارض ہے، جہاں تک اُس زمانے کے درمیان حق کا پہنچنا بہ آسانی ممکن تھا۔

زمین کے نقشہ (map) پر نظر ڈالیں تو عرب کے ایک طرف بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) ہوگا، جس کے دوسری طرف یورپ کا براعظم واقع ہے۔ اِسی طرح اگر آپ عرب سے افریقہ کی طرف چلیں تو اس کی آخری سرحد پر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) ہوگا، جس کے دوسری طرف امریکا کا براعظم واقع ہے۔ اسی طرح اگر آپ عرب سے بحرِ ہند (Indian Ocean) کی طرف چلیں تو اس کے دوسری طرف آسٹریلیا کا براعظم دکھائی دے گا۔

عقبہ بن نافع (وفات: 683ء) ایک تابعی تھے۔ وہ عرب سے ایک دستہ لے کر نکلے اور افریقہ میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے اس کے مغربی ساحل تک پہنچ گئے۔ یہاں تاحدِ نظر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) پھیلا ہوا تھا۔ وہ اُس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر کے کنارے کھڑا کیا اور کہا: **اللهم إني لو أعلم وراء هذا البحر بلداً لخُضتُه إليه، حتى لا يُعبد أحد دونك** (خدایا، اگر میں جانتا کہ اِس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا، یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے)۔

عقبہ بن نافع کا یہ واقعہ علامتی طور پر یہ بتاتا ہے کہ دورِ اول میں اسلام کی دعوتی توسیع زمین کے بری حصے میں برابر ہوتی رہی، لیکن وہ سمندر پار کے ملکوں تک نہ پہنچ سکی، کیوں کہ سمندری سفر کے لیے اُس زمانے میں قابلِ اعتماد اسباب موجود نہ تھے۔ اِس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا۔ اِس کا ایک پہلو استحکام (consolidation) تھا۔ استحکام کے بغیر دعوتی توسیع عملاً غیر موثر ہو جاتی، حتی کہ قرآن کی حفاظت بھی ممکن نہ ہوتی۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے عالمی حالات پیدا کئے کہ ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم ہو گیا۔ یہ مسلم ایمپائر اِس بات کا ضامن تھا کہ خدا کا آخری دین پوری طرح محفوظ ہو جائے اور اس کی اشاعت مسلسل جاری رہے۔

مذکورہ استحکام کے دور میں اس کے زیر اثر ایک اور تاریخی پراسس (historical process) شروع ہوا۔ اِس کا مقصد تھا فطرت (nature) میں چھپے ہوئے امکانات کو وقوع میں لانا۔ یہ عمل تدریج کے ساتھ تاریخ میں جاری رہا۔ اِس عمل کا آغاز ابتداءً مسلمانوں نے کیا۔ اس کے بعد

یورپ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار وہ چیز وجود میں آ گئی جس کو کمیونکیشن کا دور (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اِس مواصلاتی انقلاب کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی توسیع زمین کے برّی حصے تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ سمندر پار کے ملکوں تک بہ آسانی پہنچ جائے۔

اسلامی دعوت کی عالمی توسیع اول دن سے اسلام کا نشانہ تھی (25 :1)۔ مگر اسلام کی یہ عالمی توسیع، اسباب کی اِس دنیا میں ضروری وسائل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جدید مواصلاتی انقلاب نے اِس کو پوری طرح ممکن بنا دیا۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی واقعہ تھا جس کی خبر پیشگی طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں دے دی تھی: لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث:24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی گھر یا خیمہ ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔

اسلام ایک دعوتی مشن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسان جو اِس زمین پر پیدا ہوئے، اُن کو موت سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) ان کے بارے میں کیا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں اس کو مسلسل طور پر جاری رہنا ہے۔ آغاز کے پہلے مرحلے میں اس کی توسیع زمین کے بری حصہ (ایشیا اور افریقہ) میں ہوتی رہی۔ اس کے بعد استحکام کے ساتھ ایسے مادی اسباب پیدا ہوئے جس کے تحت مواصلاتی ذرائع میں ایسا انقلاب آیا جس کے تحت یہ ممکن ہو گیا کہ اسلامی دعوت کی عالمی اشاعت کا کام کیا جا سکے۔ موجودہ زمانے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اور دوسرے ذرائع کی بنا پر اسلامی دعوت کے اِس عالمی نشانے کو پورا کرنا آخری حد تک ممکن ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ زمانے میں مذہبی آزادی (religious freedom) بھی مکمل طور پر حاصل ہو چکی ہے۔ اب امتِ محمدی سے وابستہ افراد کی یہ لازمی ذمے داری ہے کہ وہ اسلام کے دعوتی مشن کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچائیں، یہاں تک کہ کرۂ ارض پر بسنے والا کوئی مرد یا عورت خدا کے اِس پیغام سے بے خبر نہ رہے۔

امتِ مسلمہ کو درپیش چیلنج

میرے مطالعے کے مطابق، عرب وعجم کے تمام مسلمان اِس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کو مختلف قسم کے چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ تقریباً دوسو سال کی غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ چیلنج بدستور باقی ہے۔ ایسی حالت میں یہ بات بے حد قابلِ غور ہے کہ اس چیلنج کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے حوالے سے مسلمانوں کا لائحہ عمل متعین کیا جائے۔

چیلنج کیا ہے۔ چیلنج کا لفظ مسئلہ (problem) کے لفظ سے مختلف ہے۔ مسئلہ ایک منفی لفظ ہے، جب کہ چیلنج ایک مثبت لفظ ہے۔ چیلنج نسبتاً ایک نیا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے — ایک نیا یا مشکل مسئلہ جو کہ آدمی کے لیے اس کی استعداد کا امتحان ہوتا ہے:

A new or difficult task that tests somebody's ability and skill.

چیلنج کا رسپانس دینے کی دو صورتیں ہیں — نگیٹیو رسپانس (negative response) اور پازیٹیو رسپانس (positive response)۔ نگیٹیو رسپانس یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی چیلنج کا سامنا ہو تو وہ منفی ردعمل کا شکار ہو جائے۔ ایسے آدمی یا گروہ کا حال یہ ہوگا کہ چیلنج پیش آنے کے بعد وہ نفرت اور شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہی نفسیات اس کو تشدد تک لے جائے گی اور آخر کار خودکش بم باری تک۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا یہی حال ہوا ہے۔ تقریباً دوسو سال پہلے اُن کو مغربی اقوام یا مغربی تہذیب کی طرف سے چیلنج پیش آیا۔ عرب سے عجم تک تمام مسلمان کم وبیش اس کا شکار ہوئے۔ مگر تمام مسلمانوں کا حال یہ ہوا کہ انھوں نے اِس چیلنج کا منفی رسپانس دیا۔ اِس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو یک طرفہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اِس جدید چیلنج کے مقابلے میں، صحیح طریقہ یہ تھا کہ مسلمان اس کا مثبت رسپانس دیتے۔ اِس معاملے میں مثبت رسپانس یہ تھا کہ وہ گہرائی کے ساتھ جدید چیلنج کا مطالعہ کرتے۔ وہ اِس قانونِ فطرت کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرتے کہ — جب بھی کوئی چیلنج سامنے آتا ہے تو

وہ مسائل (problems) کے علاوہ، نئے امکانات (opportunities) بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اِس امکان کو سمجھے اور اس کو استعمال کرے۔

مغربی چیلنج کیا تھا، وہ دراصل یہ تھا کہ مغربی قوموں نے فطرت (nature) کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے نئی طاقتیں دریافت کیں۔ مثلاً پرنٹنگ پریس، مشین، کمیونکیشن، وغیرہ۔ اِس طرح ایک نئی تہذیب (civilization) وجود میں آئی۔ اِس واقعے نے مغربی قوموں کو نئی طاقت دے دی۔ انھوں نے قدیم دنیا پر فکری اور عملی غلبہ حاصل کرلیا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ مغربی قومیں غالب اور مسلمان مغلوب بن کر رہ گئے ہیں۔

اِس نئی پیش آمدہ صورتِ حال کے مقابلے میں مسلمانوں نے صرف منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کیا۔ صحیح یہ تھا کہ وہ جدید دریافتوں کے پیدا کردہ امکانات کو عالمی امکانات سمجھتے۔ جس طرح اِن امکانات کو اہلِ مغرب نے اپنے حق میں استعمال کیا ہے، اُسی طرح مسلمان بھی اِن جدید امکانات کو اپنے حق میں استعمال کرتے۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے، جدید چیلنج کا مثبت رسپانس ہوتا۔ مسلمان اگر ایسا کرتے تو یقینی طور پر وہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لیتے۔

یہ اِس معاملے کا عقلی پہلو ہے۔ اگر اِس معاملے کو خالص دینی اعتبار سے دیکھیں، تب بھی معلوم ہوگا کہ جدید چیلنج کی نسبت سے مسلمانوں کا یہ رویہ یقینی طور پر درست نہ تھا۔ موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان متفقہ طور پر ایک ہی بات کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ موجودہ صورتِ حال کو مغربی قوموں کی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک بے بنیاد بات ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان اگر صبر اور تقویٰ کی روش اختیار کریں، تو دوسروں کی سازش انھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی (3: 120)۔ قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوا کہ اِس دنیا میں کسی گروہ کے خلاف سازش (conspiracy) اصل مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ خود اُس گروہ کے اندر صبر اور تقویٰ کی اسپرٹ باقی نہ رہے۔

یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے ایک لمبی دعا کی۔ اِس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے یقین دہانی کرتے ہوئے اپنے پیغمبر سے فرمایا: **یا محمد، إنی أعطیت لأمتك أن لا أسلّط علیهم عدوًّا من سوىٰ أنفسهم** (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2889) یعنی اے محمد، میں نے تمھاری امت کے لیے یہ مقدر کردیا ہے کہ میں اُن کے اوپر اُن کے اپنے سوا کسی خارجی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا۔

یہ امتِ محمدی کے لیے کسی پراسرار فضیلت کی بات نہیں، بلکہ یہ ایک تاریخی واقعے کی بات ہے۔ خاتم النبیین کی امت ہونے کی حیثیت سے، امتِ محمدی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آنا تھا کہ وہ بعد کے دور میں پہنچے، یعنی ایک ایسے دور میں جب کہ حالات مکمل طور پر بدل جائیں گے۔ یہ دور وہی ہے جس کو ہم آزادی اور جمہوریت اور اقوامِ متحدہ (UNO) کا دور کہتے ہیں۔ اِس نئے دور میں خود حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں یہ ممکن ہوگیا کہ کوئی خارجی دشمن کسی کے لیے مسئلہ نہ بنے۔ اِس نئے دور میں اگر کوئی گروہ سنگین مسائل سے دوچار ہے تو وہ خود اپنی غلطی کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اب خود حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں کسی گروہ کے لیے خارجی حملہ (external invasion) کا مسئلہ نہیں ہے، وہ صرف داخلی ناکامی (internal failure) کا مسئلہ ہے۔

ممبئی میں حلقہ الرسالہ سے وابستہ افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر مہینہ کے پہلے اتوار کو تین بجے حسب ذیل مقام پر ہوتی ہے:

Glow Pharma, 302, A Wing,
Koldongri CHS, Parsi Wada Bus Stop
Sahar Road, Andheri, East Mumbai

کلکتہ میں الرسالہ سے وابستہ افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر ماہ کے آخری سنیچر کو ہوتی ہے۔
رابطہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Mr. Abdullah: 09831345685,
Imam Shafique Qasmi: 09903708808

ایک خطاب

(13 جون 2012 کو بیروہ (کشمیر) میں حلقہ الرسالہ کے تحت ایک دعوہ میٹ ہوئی۔ اُس کے لیے صدر اسلامی مرکز نے دہلی میں اپنا ایک پیغام ریکارڈ کروایا جو اس دعوہ میٹ میں سنایا گیا۔ زیر نظر مضمون اسی خطاب پر مشتمل ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر چیز کا ایک سپر فارمولا (super-formula) ہوتا ہے۔ اسلام کا سپر فارمولا یا سنٹرل تھیم (central theme) کیا ہے، وہ ہے شکر، یعنی پہلی آیت جو قرآن مجید کی ہے: "**الحمد للہ رب العالمین**" وہی اسلام کی سنٹرل تھیم ہے۔

جب ایک مسلمان پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں سب سے پہلی آواز جو ڈالی جاتی ہے، وہ کیا ہے، وہ ہے "اللہ اکبر"، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد جب وہ قرآن کو پڑھتا ہے تو سب سے پہلی آیت یہ پڑھتا ہے کہ حمد صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس کلمہ کو وہ روزانہ اپنی پانچ وقت کی نمازوں میں بار بار دہراتا ہے۔ پھر قرآن میں ہے کہ آخرت میں بھی یہی ہوگا: "**وقیل الحمد للہ رب العالمین**"۔

دنیا سے لے کر آخرت تک جو سب سے بڑی چیز مقرر کی گئی ہے، وہ ہے حمد میں جینا۔ حمد کیا ہے، وہ شکر ہے۔ اللہ کی عظمت کو جب آپ پہچانتے ہیں، جب آپ اللہ کی بڑائی کو دریافت کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے، وہ ہے اعتراف (acknowledgement)، اسی اعتراف کا دوسرا نام شکر ہے۔ خود کو جانچنے کے لیے کہ میں اسلام پر ہوں یا نہیں، اللہ کے صحیح راستہ پر ہوں یا نہیں، اس کو پہچاننے کا جو معیار ہے، وہ حمد ہے۔ اگر آپ کو یہ سمجھنا ہے کہ میں اللہ کے راستہ پر ہوں کہ نہیں، تو اپنے آپ کو اس اعتبار سے جانچئے کہ آپ کے اندر شکر کی نفسیات ہے یا نہیں۔

دیکھئے، شکر کرنے والے ہی کے لیے جنت ہے۔ قرآن میں ہے: "**إلّا من أتی اللہ بقلبٍ سلیمٍ**" جو آدمی قلبِ سلیم کے ساتھ آیا آخرت میں، اس کو جنت میں داخلہ ملے گا۔ قلب سلیم کیا ہے، وہ دل جس کے اندر نفرت نہ ہو، کینہ نہ ہو، غصہ نہ ہو، کسی کے خلاف برائی نہ ہو، جو ایسا دل لے کر آخرت میں پہنچا، اسی کے لیے جنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک صحابی کے کندھے پر

ہاتھ رکھا اور کہا کہ: اگر تم سے ہو سکے تو تم اپنی صبح اور شام اس طرح کرو کہ تمھارے دل میں کسی کے خلاف غِش نہ ہو، کینہ (malice) نہ ہو، نفرت نہ ہو، یہ سب چیزیں نہ ہوں۔ اس کو ہم اگر دوسرا لفظ دیں تو کہیں گے کہ — مثبت سوچ (positive thinking) کے ساتھ دنیا میں رہو، مثبت سوچ کے ساتھ جیو، مثبت سوچ کے ساتھ مرو۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے جنت ہے۔

دیکھئے ہوتا کیا ہے، ہم سب جانتے ہیں اس بات کو، لیکن ہم کسی چیز کو الگ کر دیتے ہیں۔ مثلاً پولٹکل (political) شکایت ہوتی ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ یہ تو الگ چیز ہے۔ پولٹکل شکایت الگ چیز نہیں ہے، پولٹکل شکایت بھی اسی میں شامل ہے۔ دوسری شکایتوں کو لے کر اگر آپ نگیٹیو (negative) ہو گئے، دوسری شکایتوں کو لے کر اگر آپ کی پازیٹیو تھنکنگ (positive thinking) ختم ہو گئی، تو آپ نے جنت کا رسک (risk) لیا۔ اسی طرح دیکھئے، پولٹکل شکایتوں کو لے کر اگر آپ نیگیٹیو (negative) ہو گئے، آپ کے اندر نفرت آئی، تشدد آیا، تو بس جنت رسک میں آ گئی۔ یاد رکھئے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں آپ کو کوئی بھی اکسکیوز (excuse) لینا نہیں ہے۔ نہ پولیٹکل اکسکیوز (political excuse) نہ ہی سوشل اکسکیوز (social excuse) نہ ہی اور کوئی اکسکیوز (excuse)۔

جب بھی کوئی تجربہ آپ کے اندر ناشکری پیدا کرے، آپ کے اندر نفرت پیدا کرے، آپ کو نفرت اور تشدد کی طرف لے جائے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ شیطان کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے آغاز ہی میں ایک مثال قائم کر دی۔ ایک طرف تھے فرشتے، دوسری طرف تھا ابلیس۔ ابلیس شکایت کے راستہ پر چلا: ''ربِّ بما أغويتَني''۔ ابلیس نے نعوذ باللہ، اللہ تعالی سے شکایت کی۔ فرشتوں نے کہا کہ جو آپ کا حکم ہے، یعنی جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، ہم اس کو دل سے مانتے ہیں۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے نمونہ قائم کر دیا کہ جو نفرت اور شکایت اور تشدد کے راستہ پر چلے گا، اس کا انجام شیطان کے ساتھ ہوگا، اور جو محبت، خیر خواہی اور امن اور positivity کے راستے پر چلے گا، اس کے لئے جنت ہے، اس کے لیے اللہ کی رضا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اسی اعتبار سے اپنا محاسبہ (introspection) کرنا چاہئے کہ ہم نے اپنی family life میں، اپنی social life میں اور اپنی قومی زندگی میں کون سا راستہ

اختیار کیا ہے— نفرت والا راستہ یا محبت والا راستہ، امن والا راستہ یا تشدد والا راستہ۔ اسی سے فیصلہ ہوگا کہ ہم اللہ کے راستے پر ہیں، یا شیطان کے راستے پر ہیں۔

یہ سب سے بڑی چیز ہے جس کا ہمیں ہر صبح وشام محاسبہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ ہر آدمی کو مرنا ہے۔ مرنے کے بعد اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یاد رکھئے، اللہ کے سامنے کوئی اکسکیوز (excuse) نہیں چلے گا، کوئی عذر نہیں چلے گا۔ جو پرسنالٹی (personality) آپ نے بنائی ہے، اُسی کے ساتھ آپ خدا کے سامنے جائیں گے۔ دنیا میں جو تجربات ہوتے ہیں، اس کے درمیان کیا ہوتا ہے— کسی کی پرسنالٹی، پازیٹیو پرسنالٹی (positive personality) بنتی ہے اور کسی کی نیگیٹیو پرسنالٹی (negative personality) بنتی ہے۔ کوئی آدمی ہوتا ہے نفرت میں جینے والا، کوئی ہوتا ہے محبت اور خیر خواہی میں جینے والا، کوئی ہوتا ہے امن میں جینے والا، کوئی ہوتا ہے تشدد میں جینے والا۔ اسی چیز سے آدمی کی پرسنالٹی بنتی۔ یہی پرسنالٹی آدمی کو یا تو جہنم میں لے جائے گی یا جنت میں لے جائے گی۔

جیسے میں اس وقت دلّی میں ہوں۔ میں بول رہا ہوں اور آپ لوگ کشمیر میں میری آواز کو سن رہے ہیں۔ دلّی اور کشمیر کے بیچ میں 850 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اتنی دوری کے باوجود میں آپ کو ایڈریس کر رہا ہوں، آپ میری بات کو سن رہے ہیں۔ کتنی بڑی نعمت ہے یہ۔ پچھلے زمانہ میں کسی بادشاہ کو بھی یہ نعمت حاصل نہیں تھی، اسی کا نام شکر ہے، ہم کو رات دن شکر ہی کرتے رہنا چاہئے۔

میرا مشورہ ہے، شکر میں جینے والا بنئے، شکر کے آئٹم کو تلاش کیجئے، اور ناشکری کے آئٹم کو بھلایئے۔ چاہے پولٹکل لائف ہو یا کوئی اور لائف ہو، ہر جگہ دونوں قسم کے آئٹم ہوتے ہیں، شکر کے بھی اور ناشکری کے بھی۔ تو شکر کے آئٹم کو تلاش کر کے، اس کو اپنے مائنڈ میں بٹھایئے، ناشکری کے آئٹم کو بھلایئے، بھلایئے، بھلایئے، تاکہ آپ کے اندر مثبت شخصیت (positive personality) بنے، یعنی وہ پرسنالٹی جو آپ کو جنت کا مستحق بنائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اور آپ کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے، اور ہم آپ اللہ کے سامنے اس طرح حاضر ہوں کہ اللہ ہمیں قبول کرے، وہ ہمیں رد نہ کردے۔ **أقول قولي هذا، وأستغفر الله لي ولكم اجمعين۔**

ایک خط

عزیزم عبدالرحمٰن چاؤش　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

16 مئی 2012 کو ٹیلی فون پر یہ خبر ملی کہ عزیزہ ام السلام (پیدائش: 1950) کا انتقال ہوگیا: إنا لله وإنا إليه راجعون ۔مرحومہ میری اولاد میں بلکہ میری پوری فیملی میں سب سے زیادہ نیک خاتون تھیں۔ خاندان کے کسی شخص کو کبھی اُن سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش نہیں آیا۔ وہ پورے معنوں میں صبر وشکر کا پیکر تھیں۔ اپنی صفات کے اعتبار سے وہ بلاشبہہ ایک جنتی خاتون تھیں۔ مرحومہ اتنا زیادہ صالح مزاج کی خاتون تھیں کہ وہ نہ کبھی کسی سے فرمائش کرتی تھیں، نہ کسی سے ان کو شکایت ہوتی تھی۔ وہ گھر میں کبھی کوئی پرابلم پیدا نہیں کرتی تھیں۔ وہ کبھی دنیوی باتوں کا چرچا نہیں کرتی تھیں۔ بس اپنی ذمے داری ادا کرنا اور نماز، روزہ کرنا، یہی ان کا مشغلہ تھا۔ صبر، قناعت، سادگی، شکر، یہ سب باتیں ان کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔

ام السلام بظاہر میرے دعوتی مشن میں براہِ راست شریک نہ تھیں، مگر وہ برابر اس کے لئے دعا کرتی تھیں۔ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ میرے تمام بچے، بلکہ بچوں کے بچے بھی میرے دعوتی مشن میں کسی نہ کسی پہلو سے شریک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے زیادہ دخل ام السلام کی دعاؤں کا ہے۔ مرحومہ اس بات کی ایک انوکھی مثال تھیں کہ دعوتی مشن میں شریک نہ ہوتے ہوئے بھی ایک شخص بالواسطہ طور پر دعوتی مشن کے لیے بہت بڑا کام کرسکتا ہے۔ مرحومہ دل سے میرے دعوتی مشن میں شریک تھیں۔ وہ اپنے شوہر محمد عثمان چاؤش (وفات: 2005) کے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہ بنیں۔ ان کے اِسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ محمد عثمان چاؤش صاحب کو یہ موقع ملا کہ وہ پورے مہاراشٹر میں ہمارے دعوتی لٹریچر کو پھیلا دیں۔ اِس طرح دعوتی مشن میں اُن کی خاموش شرکت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی اولادیں سب کی سب، دعوتی مشن میں شامل ہوگئیں۔ وہ مقرر یا محرر نہ تھیں، مگر انھوں نے اپنے صالح مزاج کی بنا پر مقرر اور محرر سے بھی زیادہ بڑا کام کیا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ میری دعا ہے کہ آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ مرحومہ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آپ کے گھر میں ان کے جانے سے جو کمی واقع ہوئی ہے، خدا اس کی بھرپور تلافی فرمائے۔

نئی دہلی، یکم جون 2012　　دعا گو　　وحید الدین

شبِ قدر

رمضان کا مہینہ ہجری کیلنڈر کا نواں مہینہ ہے۔ اِس مہینے میں اہلِ ایمان کے لیے روزہ رکھنے کا حکم ہے (2:183)۔ رمضان کے مہینے کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کسی رات میں شبِ قدر واقع ہوتی ہے۔ شبِ قدر کو قرآن میں 'لیلۃ القدر' کہا گیا ہے۔ یہ 'لیلۃ القدر' دوسری ہزار راتوں سے زیادہ بہتر ہے۔ شبِ قدر کا ذِکر قرآن کی سورہ القدر (97) میں آیا ہے۔ اِس سورہ کا ترجمہ یہ ہے: ''بے شک ہم نے قرآن کو اتارا ہے شبِ قدر میں۔ اور تم کو کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں، ہر حکم لے کر۔ وہ رات سرتاسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک''۔

یہ 610ء کی ایک رات تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریب غارِ حرا میں موجود تھے۔ اُس وقت جبریل، قرآن کی پہلی وحی لے کر آپ کے پاس آئے۔ یہ پہلی وحی سورہ العلق (96) کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں۔ قرآن کا نزول خدا کی عظیم رحمت کا نزول تھا، اِس لیے اُس رات کو ایک یادگار رات قرار دیا گیا۔

شبِ قدر کے موقع پر خدا اپنے سالانہ فیصلے فرماتا ہے۔ اِس لیے یہ رات ذکر اور دعا اور عبادت اور تلاوت کی رات قرار دی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کو اِس موقع پر زیادہ سے زیادہ خدا کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ دعا کرنا چاہیے، تاکہ خدا کے سالانہ فیصلوں میں اُس کو خدا کی رحمت میں زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ وہ خدا کے نزدیک زیادہ سے زیادہ انعام کا مستحق قرار پائے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں رمضان کی آخری راتوں میں اعتکاف میں تھا، اُس وقت مجھ پر شبِ قدر کا علم اُتارا گیا۔ میں مسجد سے باہر نکلا، تاکہ میں تم کو شبِ قدر کے وقت کے بارے میں بتا دوں، لیکن اُس وقت مدینہ کے دو مسلمان آپس میں لڑ گیے، اِس کے بعد شبِ قدر کا علم اٹھا لیا گیا (فتلاحیٰ رجُلان من المسلمين، فرُفعت) صحيح البخاري، رقم الحديث: 1919۔

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شبِ قدر کی خصوصی رحمتوں میں حصّے دار بننے کے لیے کیا چیز ضروری ہے، وہ چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر لڑائی جھگڑے کا مزاج نہ ہو۔ اُس کا دل نفرت جیسے منفی جذبات سے خالی ہو۔ اُس کا ذہن پوری طرح مثبت انداز میں سوچنے والا ہو۔ جو عورت یا مرد اپنے اندر اِس قسم کی مثبت شخصیت رکھتے ہوں، انھیں کو شبِ قدر کی رحمتوں میں حصہ ملے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں شبِ قدر کو پاؤں تو میں کیا دعا کروں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اِس طرح کہو: **اللهم إنك عفوٌّ تحبّ العفو، فاعفُ عني** (سنن التّرمذی، رقم الحدیث: 3513) یعنی اے اللہ، تو سرتا پا معافی ہے اور تو معافی کو پسند کرتا ہے، پس تو مجھے معاف فرما۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ شبِ قدر میں آدمی کے اندر سب سے زیادہ طلب کس چیز کی ہونا چاہیے، وہ یہ کہ آدمی موت کے بعد آنے والی ابدی زندگی کی کامیابی کا حریص ہو۔ وہ اللہ سے یہ درخواست کرے کہ — خدایا، تو میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما، آخرت کی ابدی زندگی میں تو مجھے دوزخ سے بچا، اور جنت کے باغوں میں تو مجھے جگہ عطا فرما۔

قرآن کے مطابق، شبِ قدر میں کثرت سے خدا کے فرشتے اترتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شبِ قدر کی صورت میں ہر عورت اور مرد کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ فرشتوں کا ہم نشیں بنے۔ وہ فرشتوں سے ایسی روحانی غذا لے جس کے نتیجے میں اُس کا دل سلامتی کے جذبات سے بھر جائے۔ وہ منفی جذبات اور دنیا پرستی سے اوپر اٹھ جائے اور حقیقی معنوں میں وہ خدا کا طالب بن جائے۔ ایسا ہی دل و دماغ رکھنے والے لوگ شبِ قدر کے موقع پر خدا کی خصوصی رحمتوں میں حصے دار بنیں گے۔

شبِ قدر ایک اعتبار سے شبِ امن ہے۔ جس عورت یا مرد کو شبِ قدر کی رحمتیں مل جائیں، اُس کا دل امن و سلامتی کے جذبات سے بھر جائے گا۔ اس کی سوچ پُر امن سوچ ہوگی۔ اس کی گفتگو پُر امن گفتگو ہوگی۔ اس کا کردار پُر امن کردار ہوگا۔ اس کا طریقہ پُر امن طریقہ ہوگا۔ اس کی پوری شخصیت امن پسند شخصیت بن جائے گی۔ اس کے ذریعے سے دوسروں کو جو چیز ملے گی، وہ امن ہوگا اور صرف امن۔

قرآن: کتابِ قدر

قرآن کی سورہ القدر کی پہلی آیت یہ ہے: إنّا أنزلناه في ليلة القدر (97:1) یعنی ہم نے قرآن کو اتارا ہے قدر کی رات میں۔ اِس آیت میں قدر کا مطلب تقدیر (Destiny) ہے۔ اِس آیت میں قدر کی نسبت رات کی طرف کی گئی ہے، مگر حقیقت میں اس کی نسبت قرآن کی طرف ہے، یعنی وہ رات جس میں کتابِ قدر (Book of Destiny) اتاری گئی۔

قرآن میں انسان کی تقدیر بتائی گئی ہے، یعنی وہ قوانینِ فطرت جو انسان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے ہیں، فرد کی تقدیر بھی اور قوم کی تقدیر بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ قرآن کے اِن ابدی قوانینِ تقدیر کو معلوم کرے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔

مثلاً قرآن کی ایک آیت یہ ہے: إن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئاً (3: 120) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو دوسروں کی سازش تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے مقرر کئے ہوئے قانونِ حیات کے مطابق، انسان کی طاقت کا سرچشمہ صبر اور تقویٰ ہے۔ کسی فرد یا قوم کا اصل مسئلہ سازشِ غیر کی موجودگی نہیں، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے اپنے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود نہیں۔

اِس قانونِ فطرت کے مطابق، اگر کوئی قوم یہ پائے کہ دوسرے لوگ اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کا سبب خود اپنے اندر تلاش کرے، نہ کہ اپنے آپ سے باہر۔ اِس طرح کی صورتِ حال میں کسی مفروضہ حریف کے خلاف شکایت اور احتجاج کی تحریک چلانا اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ایک غیر متعلق (irrelevant) کام ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایسے موقع پر خود اپنا جائزہ لیا جائے، صبر وتقویٰ کے اعتبار سے اپنی کمیوں کو تلاش کیا جائے۔ جو لوگ اِس اعتبار سے قرآن کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں، وہی شبِ قدر کی برکتوں کو پائیں گے۔

سوال و جواب

سوال

آپ نے لکھا ہے کہ جنت کسی کی سفارش سے نہیں ملتی، اگر ایسا ہے تو اِس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ میری شفاعت میری اُمت کے گناہِ کبیرہ کرنے والوں کے لئے ہے: **شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي** (**مسند أحمد، رقم الحديث**: 13566)۔ ابھی الرسالہ، جون 2012 کا شمارہ مجھے ملا۔ اُس میں ''وسیلہ کی حقیقت'' کے عنوان سے آپ کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اِس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے جنت اور مغفرت حاصل نہیں ہوگی اور اس کو وسیلہ کا نام دینا خود ساختہ مفہوم ہے۔ جو شخص اپنے عمل کے اعتبار سے جنتی نہ ہو، وہ پیغمبر کی سفارش سے جنتی نہیں بن جائے گا۔ اگر کوئی شخص شفاعت کا یہ مطلب سمجھتا ہے تو یہ مطلب صحیح نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ نہ کسی کو پیغمبر کی سفارش سے جنت اور مغفرت حاصل ہوگی اور نہ کوئی جہنمی شخص پیغمبر کی سفارش سے جنتی بن جائے گا۔ یہ تمام تر اللہ کا عطیہ ہے، قرآن اور حدیث دونوں میں اِس بارے میں واضح ہدایات ہیں۔

میں جاننا چاہوں گا کہ قرآن کی کس آیت میں اور حدیث کی کس روایت میں یہ واضح ہدایات موجود ہیں۔ آپ نے شفاعت کا جو مطلب بیان کیا ہے، اُس کی روشنی میں ''**شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي**'' کا مفہوم واضح فرمائیں۔ (اے، جے، قادری، امبیڈکر نگر، یوپی)

جواب

احادیث کے بارے میں علما کا مسلک یہ ہے کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہو تو ایک حدیث کو لیا جائے گا اور دوسری حدیث کی تاویل کی جائے گی، مسند احمد کی مذکورہ روایت کا معاملہ یہی ہے۔ ایک طرف یہ حدیث ہے اور دوسری طرف ایسی کئی روایتیں ہیں جو اِس حدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں اِس سلسلے میں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

1- ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **والله ما أدري، وأنا رسول الله، ما يُفعل بي، ولا بكم** (**صحيح البخاري، رقم الحديث**: 7018) یعنی خدا کی قسم، میں

نہیں جانتا، اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمھارے ساتھ۔

2 - عن أبي هريرة قال لمّا نزلت: وأنذر عشيرتك الأقربين۔ جَمَعَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم قريشا فخصّ وعَمّ، فقال يا معشر قريش، انقذوا انفسكم من النار، فإني لا أملك لكم من الله ضرًّا ولانفعًا۔ يا معشر بني عبد مناف، أنقذوا أنفسكم من النار، فإني لا أملك لكم من الله ضرًّا ولا نفعًا۔ يا معشر قُصي، انقذوا أنفسكم من النار، فإني لا أملك لكم من الله ضرًّا ولا نفعًا۔ يا معشر بني عبد المطلب، أنقذوا أنفسكم من النار، فإني لا أملك لكم من الله ضرًا ولا نفعًا۔ يا فاطمة بنت محمّد، أنقذي نفسكِ من النار فإني لا أملك لكِ من الله ضرًا ولا نفعًا۔ (سنن الترمذي، رقم الحديث:3185)

یعنی جب قرآن کی یہ آیت اتری: وأنذر عشيرتك الأقربين (26:214) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں کو جمع کیا۔ آپ نے خصوصی طور پر اور عمومی طور پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے قریش کے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کسی ضرر پر قدرت رکھتا اور نہ کسی نفع پر۔ اے بنو عبد مناف کے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کسی ضرر پر قدرت رکھتا اور نہ کسی نفع پر۔ اے بنی قُصَی کے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کسی ضرر پر قدرت رکھتا اور نہ کسی نفع پر۔ اے بنو عبد المطلب کے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کسی ضرر پر قدرت رکھتا اور نہ کسی نفع پر۔ اے فاطمہ بنتِ محمد، تم اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کسی ضرر پر قدرت رکھتا اور نہ کسی نفع پر۔

3- عن عائشة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: سدّدوا وقاربوا وأبشروا، فإنه لايُدخل أحدًا الجنةَ عملُه۔ قالوا: ولا أنت يا رسول الله۔ قال: ولا أنا، إلا أن يتغمّدني الله بمغفرة ورحمة (صحيح البخاري، رقم الحديث: 6467) یعنی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنا رویہ درست رکھو اور میانہ روی پر قائم رہو اور پُر امید رہو، کیوں کہ کسی بھی شخص کو اُس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا آپ کو بھی نہیں اے خدا کے رسول، آپ نے فرمایا کہ ہاں مجھ کو بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھ کو اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے۔

یہی بات قرآن میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **لیس للإنسان إلاّ ما سعی** (53:39)۔ اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کچھ نہ کر سکے گا۔ اُس دن سارا معاملہ صرف اللہ کے اختیار میں ہوگا: **یوم لا تملك نفسٌ لنفس شیئاً، والأمر یومئذ لله** (82:19)۔ اِن آیتوں اور اِن حدیثوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کا جنت میں داخلہ صرف اپنے ذاتی عمل کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ کسی دوسرے شخص کی سفارش کی بنیاد پر۔ ایسی حالت میں مسلّمہ اصول کی بنیاد پر مذکورہ روایت (**شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي**) یا اِس قسم کی کسی اور حدیثِ شفاعت کی تاویل کی جائے گی۔ وہ تاویل یہ ہے کہ حدیث میں شفاعت سے مراد سفارش (recommendation) نہیں ہے، بلکہ شہادت (witness) ہے۔ اِس تاویل کا درست ہونا خود قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن کی سورہ الزخرف میں یہ آیت اِس موضوع پر حجتِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: **ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعةَ، إلاّ من شهد بالحق وهم یعلمون** (43:86) یعنی اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، مگر وہ جو حق کی گواہی دیں اور وہ جانتے ہوں گے۔

اِس آیت کی تشریح یہ ہے کہ ''قیامت میں پیغمبر اور داعیانِ حق جو شفاعت کریں گے، وہ حقیقۃً شفاعت نہیں ہے، بلکہ شہادت ہے، یعنی ایسی بات کی گواہی دینا جس کو آدمی ذاتی طور پر جانتا ہو۔ آخرت میں جب لوگوں کا مقدمہ پیش ہوگا تو سارے علم کے باوجود اللہ تعالیٰ مزید تائید کے طور پر اُن لوگوں کو کھڑا کرے گا جو قوموں کے ہم عصر تھے، انھوں نے اُن کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا، پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا، کسی نے حق کا ساتھ دیا اور کوئی حق کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔

یہی تجربہ جو اُن صالحین پر براہِ راست گزرا، اس کو وہ خدا کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ ایسا ہی

ہوگا جیسے کہ کوئی گواہ عدالت میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ایک سچا بیان دے۔ اِس کے سوا کسی کو قیامت میں یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مجرم کا شافع بن کر کھڑا ہو اور وہ اس کے بارے میں اُس خدائی فیصلے کو بدل دے جو از روئے واقعہ اس کے بارے میں ہونے والا تھا۔ خدا اِس سے بہت بلند ہے کہ اُس کے حضور کوئی شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے''۔ (تذکیر القرآن، صفحہ: 1351)

سوال

غلو کیا ہے اور غلو کا نقصان کیا ہے۔ براہِ کرم، اس کو واضح فرمائیں، نیز یہ بتائیں کہ کسی تحریک سے وابستہ افراد اپنی تحریک کو غلو اور فرقہ بندی کی نفسیات سے کس طرح بچا سکتے ہیں۔

(عبد الباسط عمری، دوحہ، قطر)

جواب

اسلام میں غلو سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعت قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ قرآن اور حدیث میں اگرچہ غلو کے لیے حرام کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے غلو کی برائی یقینی طور پر حرام سے کم نہیں۔

غلو کا مطلب حد سے تجاوز کرنا ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جا سکتا ہے۔ غلو کی دو قسمیں ہیں — اعتقادی غلو، اور عملی غلو۔ دونوں قسم کے غلو کی نوعیت ایک دوسرے سے الگ ہے۔ عملی غلو سے انفرادی مزاج میں بگاڑ آتا ہے، لیکن اعتقادی غلو کی برائی اِس سے زیادہ ہے۔ اعتقادی غلو اگر بڑھ جائے تو اُس سے نئے نئے فرقے وجود میں آتے ہیں۔

عملی غلو کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ ہوائی جہاز سے سفر کرنا سنت کے خلاف ہے اور پھر وہ حج کے لیے پیدل یا اونٹ کے ذریعے سفر کر کے مکہ پہنچے۔ یہ طریقہ ایک شخص کے مزاج میں انتہا پسندی پیدا کر سکتا ہے، لیکن اُس سے کوئی الگ فرقہ نہیں بنے گا۔

اعتقادی غلو زیادہ شدید قسم کا غلو ہے۔ ایک شخص اعتقادی غلو کی بات کرے اور پھر بہت سے لوگ اس کے ماننے والے بن جائیں تو اس سے ایک نیا فرقہ وجود میں آجائے گا۔ مثلاً کوئی شخص یہ دعویٰ

کرے کہ نبوت کُلّی معنوں میں ختم نہیں ہوئی، زمانے کے بدلنے سے دوبارہ کوئی نبی آسکتا ہے، اور اِس نئے پیغمبر پر ایمان لانا اس کے معاصرین کی نجات کے لیے ضروری ہے۔ اِس طرح کی بات اگر زیادہ لوگ مان لیں تو اس سے دین میں ایک نیا فرقہ وجود میں آجائے گا۔

غلو ایک قسم کی بدعت ہے۔ غلو ہر حال میں ایک برائی ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایک ایسی سنت کو زندہ کرنے کے لیے کھڑا ہو جو معاصرین کو بظاہر نئی چیز معلوم ہو، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف ایک متروک سنت کا احیا ہو تو ایسی تحریک غلو نہیں۔ مثلاً دعوت الی اللہ کی تحریک۔ ایسی تحریک سے دین میں کبھی کوئی برائی پیدا نہیں ہوگی۔

آپ کے سوال کا دوسرا جُز یہ ہے کہ — کسی تحریک سے وابستہ افراد اپنی تحریک کو غلو اور فرقہ بندی کی نفسیات سے کس طرح بچا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک، اِس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے غلو اور فرقہ بندی سے بچنا غالباً ممکن نہیں۔ غلو اور فرقہ بندی کی یہ قسم اصلاً دورِ زوال کا ظاہرہ ہے۔ اِسی بنا پر یہود کے اندر بعد کے دور میں فرقے پیدا ہوئے اور اِسی بنا پر مسیحیوں میں بعد کے دور میں فرقے پیدا ہوئے اور اِسی بنا پر خود امتِ محمدی میں بعد کے دور میں فرقے پیدا ہوئے۔ چوں کہ دورِ زوال لازماً ہر تحریک پر آتا ہے، اِس لیے دورِ زوال میں اِس قسم کے غلو اور فرقہ بندی جیسی چیزیں بھی ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ اِس قسم کے غلو اور فرقہ بندی کی پیدائش کو روکنا تو ممکن نہیں ہے، البتہ دوسری چیز ممکن ہے، وہ یہ کہ تحریک کے افراد اِس سلسلے میں بہت زیادہ حساس اور باشعور ہوں۔

چناں چہ جب دورِ زوال میں اس قسم کا غلو پیدا ہو تو اُن کے درمیان ایسے مصلح اٹھیں جو دوبارہ لوگوں کو غلو سے ہٹا کر صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں، وہ اُن کو فرقہ بندی اور شخصیت پرستی کے بجائے دوبارہ حقیقی خدا پرستی کے راستے پر قائم کریں، وہ قرآن اور حدیث کے دلائل کے ذریعے اُن پر یہ واضح کریں کہ اسلام میں جو چیز مطلوب ہے، وہ غلو اور فرقہ بندی نہیں، بلکہ اعتدال اور آفاقیت ہے۔ اِس آفاقی ذہن کے بغیر نہ کوئی مذہبی تحریک کبھی کامیاب ہوسکتی ہے، اور نہ سیکولر تحریک۔

خبرنامہ اسلامی مرکز— 217

1- سہارن پور (یوپی) میں ڈاکٹر محمد اسلم خان اپنے ساتھیوں کے تعاون سے دعوتی کام کررہے ہیں۔ ٹیم کی طرف سے 15 اپریل 2012 کو وہاں کے کمشنر مسٹر گنیش شنکر تر پاٹھی کو پرافٹ آف پیس اور تذکیر القرآن (انگلش) کا نسخہ بطور ہدیہ دیا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد مسٹر شنکر نے ہمارے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ اسلام کو تشدد کا مذہب سمجھتے تھے۔ اِن کتابوں کے مطالعے کے بعد ان کا ذہن بدل گیا، اسلام سے متعلق ان کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ انھوں نے کہا کہ اِن کتابوں کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام امن اور سچائی کا مذہب ہے۔

2- مئی 2012 کے پہلے ہفتہ (6-1 مئی) میں صدر اسلامی مرکز نے ترکی کا سفر کیا۔ صدر اسلامی مرکز کے ساتھ اِس سفر میں سی پی ایس ٹیم کے تین افراد شریک تھے— ڈاکٹر فریدہ خانم، مسٹر رجت ملہوترا، مولانا محمد ذکوان ندوی۔ یہ سفر استاذ محمد فتح اللہ گولن کی تحریک کے تحت سیرتِ رسول کے موضوع پر منعقد ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے ہوا تھا۔ یہ کانفرنس ترکی کے سرحدی شہر غازی عین تاب (Gaziantep) میں 6-5 مئی 2012 کو ہوئی۔ اِس میں 60 ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے علاوہ، سفر کے دوران استانبول کے مختلف اداروں میں صدر اسلامی مرکز کے پروگرام ہوئے۔ سفر کی تفصیلی روداد، ان شاء اللہ، الرسالہ میں سفرنامے کے تحت شائع کردی جائے گی۔

3- سہارن پور کے نیشنل میڈیکل کالج (NMC) میں 9 مئی 2012 کو ایک آل انڈیا ورک شاپ منعقد ہوئی۔ اِس میں بڑی تعداد میں سہارن پور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے شرکت کی۔ مثلاً ڈاکٹر راجیو، ڈاکٹر انشُل جین، وغیرہ۔ اِن لوگوں کو ہمارے ساتھیوں کی طرف سے قرآن کا انگریزی ترجمہ برائے مطالعہ دیا گیا۔

4- سہارن پور حلقہ الرسالہ کے ایک قاری مسٹر بشیر کی بیٹی کے نکاح کے موقع پر 21 مئی 2012 کو تمام حاضرین کو سہارن پور ٹیم کی طرف سے اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں مختلف کتابیں اور پمفلٹس دیے گئے۔

5- نارتھ کیرولینا (امریکا) کے اسلامک افرس سیکشن کے تحت چلنے والے ادارہ مسلم چیپلن (Muslim Chaplain) کے ذریعے وہاں کے مسیحی لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ برائے مطالعہ دیا جارہا ہے۔ چیپلن کی درخواست پر 25 مئی 2012 کو ادارے کے پتے پر قرآن کی مزید کاپیاں اور دعوتی پمفلٹس روانہ کردیے گئے ہیں۔

6- ترکی کے ویکلی میگزین 'اکسیان' (AKSIYON) کے نمائندہ مسٹر عثمان انالن نے 25 مئی 2012 کی شام کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس کا موضوع تھا— اسلام اور جدید ترکی۔ یہ انٹرویو انگریزی زبان میں تھا جو میگزین کے شمارہ 4 جون 2012 میں شائع ہوا۔

7- انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں 2 جون 2012 کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

The Presidential Election-2012

اِس پروگرام میں صدر اسلامی مرکز کو افتتاحی خطاب (inaugural address) کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس کے مطابق، صدر اسلامی مرکز نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِس پروگرام میں شرکت کی اور انگریزی زبان میں 20 منٹ کا خطاب کیا۔ اِس موقع پر حاضرین کو پرافٹ آف پیس اور قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

8- نیشنل میڈیکل کالج (سہارن پور) میں 10 جون 2012 کو ایک پروگرام ہوا۔ اِس موقع پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔ مثلاً ڈاکٹر اے کے ڈمری (ڈائرکٹر اگنو)، ڈاکٹر جی بی لال، ڈاکٹر اُدے سنگھ، وغیرہ۔

9- سی پی ایس انٹرنیشنل (نئی دہلی) کے کچھ ساتھیوں نے کشمیر کا سفر کیا۔ اِس مناسبت سے بیروہ میں 13 جون 2012 کو ایک دعوہ میٹ ہوئی۔ اِس میں کشمیر میں دعوتی کام کرنے والے نمائندہ افراد شریک ہوئے۔ اِس اجتماع میں یہ طے کیا گیا کہ کس طرح کشمیر میں پُر امن انداز میں زیادہ منظّم طور پر دعوت کا کام کیا جائے۔ اِس موقع پر صدر اسلامی مرکز کی نئی کتاب — صبحِ کشمیر (*Dawn over Kashmir*) کے اردو اور انگریزی ایڈیشن کا اجرا کیا گیا۔

10- سہارن پور میں الوسیلہ ویلفیر سوسائٹی کی طرف سے 17 جون 2012 کو ایک آل انڈیا اسلامک کانفرنس ہوئی۔ اِس میں انڈیا کے مختلف مقامات کے علما اور دانش وروں نے شرکت کی۔ ہمارے ساتھیوں نے یہاں بڑے پیمانے پر لوگوں کو اسلامی لٹریچر برائے مطالعہ دیا۔ لوگوں نے اِس کو بخوشی قبول کیا۔

11- امریکا کے لیے صدر اسلامی مرکز کے ٹیلی فونی خطاب کا سلسلہ جاری ہے۔ موضوعات مع تاریخ درج ہیں:

April 29, 2012: The Importance of Religious Freedom

May 13, 2012: Lessons from Makkan and Madinan Periods of the Prophet

May 27, 2012: Hudaybiya Principle

12- صدر اسلامی مرکز کے مضامین اردو اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ 24 مئی 2012 کو روزنامہ راشٹریہ سہارا میں ایک مضمون ''تاریخ بشری کے پانچ دور'' شائع ہوا۔ نیز یہ مضامین انگریزی اخبارات ٹائمس آف انڈیا، وغیرہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ مضامین سی پی ایس کے ویب سائٹ (www.cpsglobal.org) موجود ہیں۔

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Monday to Thursday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of every month Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

Bringing you a splendid range of Islamic books and children's products

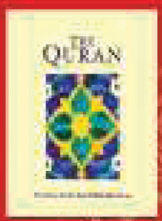

The Quran, a book which brings glad tidings to mankind along with divine admonitions, stresses the importance of man's discovery of truth on both spiritual and intellectual planes.

Peace, always desirable for its own sake, has been vital to human progress in every age. The difference now in this nuclear age is that it has literally become a matter of life and death for humanity.

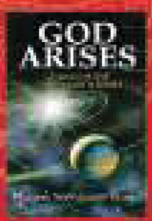

This book, the result of 30 years spent by the author in exhaustive research, attempts to present the basic teachings of religion in the light of modern knowledge and in a manner consistent with modern scientific method.

In this series, Maulana Wahiduddin Khan has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way.

Harun Yahya's books have been instrumental in helping many to return to their faith in Allah, and, for many others, a deeper insight into their faith.

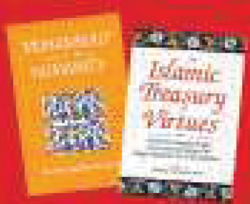

A collection of biographies, and traditions regarding the words and deeds of Prophet Muhammad.

New Releases...

GOODWORD
www.goodwordbooks.com

AL-RISALA (URDU) MONTHLY
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi - 110 013